جاری کردہ
سید ابوالاعلیٰ مودودی

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مُدیر
پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

تعارف قاضی گروپ آف کمپنیز

اور اللہ ہی نے تمہارے لئے گھروں کو رہنے کی جگہ بنایا (القرآن)

قاضی انٹرپرائزز 1988ء سے پراپرٹی اور کنسٹرکشن کے شعبہ سے منسلک ہیں۔ الحمدللہ جس ادارہ کی بنیاد تقویٰ، توکل، ایمانداری اور جذبہ خدمت خلق پر رکھی گئی تھی اس کو اللہ تعالیٰ نے دن دوگنی رات چوگنی ترقی سے نوازا۔ رب رحیم کا احسان عظیم ہے کہ ادارہ نے اپنے ذیلی اداروں کی محنت اور تعاون سے ترقی کی اور 1999ء میں تنظیم نو کرتے ہوئے (قاضی گروپ آف کمپنیز) کا آغاز کیا۔ قاضی گروپ آف کمپنیز میں مندرجہ ذیل ادارے شامل ہیں۔

★قاضی انٹرپرائزز ★قاضی کنسٹرکشن ★قاضی پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز ★قاضی ڈویلپر ★قاضی پی وی سی پائپ انڈسٹری ★اسلامک ویلفیئر فاؤنڈیشن

قاضی انٹرپرائزز ہی کیوں؟ اس لیے کہ

① ہاؤسنگ کے شعبہ میں بہترین تجربہ کار ٹیم۔ ② 4 منصوبے مکمل کرنے کا اعزاز حاصل (جہاں یا تو ہمارے ممبران رہائش پذیر ہو چکے ہیں اور یا اپنے پلاٹ فروخت کر کے کئی گنا منافع بھی کما چکے ہیں۔ آپ بھی ہمارے منصوبوں میں سرمایہ کاری کر کے فائدہ اٹھا سکتے ہیں) ③ **منی بیک گارنٹی** ہماری ہی ہے اگر آپ نے بکنگ کے بعد موقع دیکھنے پر آپ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے بتائے ہوئے منصوبے معیار کے مطابق نہیں ہیں تو آپ اپنی رقم واپس لے سکتے ہیں

④ ہر اتوار کو ہماری گاڑی دفتر سے صبح نو بجے سائٹ وزٹ کے لیے روانہ ہوتی ہے اسلئے پہلے آپ سائٹ دیکھیں اور پھر خریدیں

ہمارے منصوبے

★ الرحمن ٹاؤن (مکمل) ★پاسبان ٹاؤن (مکمل) ★ گلستان راشد فیز (I) مکمل ★ فیملی ولاز مری فیز (I) فیز (II) مکمل
★ فیملی گارڈن اسلام آباد بکنگ جاری ★ موٹروے سٹی فیز (I) فیز (II) بکنگ مکمل ★ فیملی اپارٹمنٹ مری فیز (III) بکنگ جاری
★ موٹروے سٹی فیز (III) بکنگ جاری ★ قاضی اپارٹمنٹ راولپنڈی بکنگ جاری ★ اسلام آباد ہل گارڈن بکنگ جاری

ہمارا دعوی ہمارے منصوبے سب سے سستے اور سب سے بہترین، دیکھیں اور فیصلہ کریں

موٹروے سٹی

خصوصیات

☆اسلام آباد کی طرح سرسبز و شاداب پہاڑیوں کے دامن میں
☆نیو اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ کی بدولت ہر لمحہ ترقی
☆تخت بابا اور ہمہ منتدی پارک جیسی سیرگاہیں قریب تر
☆انشاءاللہ تعالیٰ تمام ضروریات زندگی آپ کے دروازے پر
☆پاکستان موٹروے سے چند منٹ کی مسافت
☆فوج کے ریٹائرڈ افراد پر مشتمل منظم سیکورٹی سسٹم کا قیام
☆اسلامک سنٹر کے لیے پچاس کنال زمین وقف
☆قیمتوں میں اضافہ کی بدولت منافع بخش سرمایہ کاری
☆پانی جیسی نعمت کی فراوانی
☆ہر فیز میں شاپنگ سنٹر
☆کشادہ سڑکیں اور گلیاں
☆مسجد، سکول اور ہسپتال گھر کے نزدیک۔

قیمت و طریقہ ادائیگی

قیمت: 9 ہزار روپے فی مرلہ

ایڈوانس: -/1000 روپے فی مرلہ بوقت بکنگ۔

قسط: -/100 روپے فی مرلہ ماہانہ

خصوصی رعایت 29 فروری 2000ء تک

پلاٹ بک کرانے والے کو 15 ہزار روپے فی کنال کی خصوصی رعایت

سائز پلاٹ 5 مرلہ، 10 مرلہ، ایک کنال

تمام ادائیگی بذریعہ بنک ڈرافٹ بنام موٹروے سٹی اکاؤنٹ نمبر 8- ABL 1100 راشد منہاس روڈ برانچ راولپنڈی

یکمشت ادائیگی پر 10 فیصد خصوصی ڈسکاؤنٹ۔ کل قیمت کی پچاس فیصد یکمشت ادائیگی پر فوری رجسٹری

ہیڈ آفس **قاضی انٹرپرائزز**

جنگ بلڈنگ مری روڈ راولپنڈی

فون 554464 فیکس 558633

E-mail: shaukat@isb.comsats.net.pk

web: www.qazi.com.pk

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جلد : ۱۲۷ ، عدد : ۲ ، فروری ۲۰۰۰ ، ذی القعدہ ۱۴۲۰

مدیر: پروفیسر خورشید احمد

نائب مدیر: مسلم سجاد

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور

فون : ۵۴۲۵۳۵۶

فیکس : ۷۸۳۲۱۹۴

E-mail: tarjuman@pol.com.pk

مدیر انتظامی

عبدالکریم

۵-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون : ۷۵۸۷۹۱۶

فیکس : ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ : ۲۰ روپے

زر سالانہ : ۲۰۰ روپے

طلبہ و طالبات کے لیے ۱۵۰ روپے

بھارت ۳۵۰ روپے

بنگلہ دیش، ایران ۵۰۰ روپے

مشرق وسطیٰ، یورپ

مشرق بعید، افریقہ ۷۰۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۵۰ روپے

مغربی معاشرت کے نتائج

کیا آپ مغربی معاشرت کے ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہیں جو یورپ اور امریکہ میں رونما ہو چکے ہیں' اور جو اس طرز معاشرت کے طبعی اور یقینی نتائج ہیں؟ کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں کہ آپ کی سوسائٹی میں بھی وہی ہیجان انگیز اور شہوانی ماحول پیدا ہو؟ آپ کی قوم میں بھی اسی طرح بے حیائی' بے عصمتی اور فواحش کی کثرت ہو؟ امراض خبیثہ کی وبائیں پھیلیں؟ خاندان اور گھر کا نظام درہم برہم ہو جائے؟ طلاق اور تفریق کا زور ہو؟ نوجوان مرد اور عورتیں آزاد شہوت رانی کی خوگر ہو جائیں؟ منع حمل اور اسقاط حمل اور قتل اولاد سے نسلیں منقطع کی جائیں؟ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں حد اعتدال سے بڑھی ہوئی شہوانیت میں اپنی بہترین عملی قوتوں کو ضائع اور اپنی صحتوں کو برباد کریں؟ حتیٰ کہ کم سن بچوں تک میں قبل از وقت صنفی میلانات پیدا ہونے لگیں اور اس سے ان کے دماغی و جسمانی نشوونما میں ابتدا ہی سے فتور برپا ہو جایا کرے؟

اگر مادی منفعتوں اور حسی لذتوں کی خاطر آپ ان سب چیزوں کو گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں تو بلا تامل مغربی راستے پر تشریف لے جایئے اور اسلام کا نام بھی اپنی زبان پر نہ لایئے۔ اس راستے پر جانے سے پہلے آپ کو اسلام سے قطع تعلق کا اعلان کرنا پڑے گا تاکہ آپ بعد میں اس نام کو استعمال کر کے کسی کو دھوکا نہ دے سکیں اور آپ کی رسوائیاں اسلام اور مسلمانوں کے لیے موجب ننگ و عار نہ بن سکیں۔

لیکن اگر آپ ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں' اگر آپ کو ایک ایسے صالح اور پاکیزہ تمدن کی ضرورت ہے' جس میں اخلاق فاضلہ اور ملکات شریفہ پرورش پا سکیں' جس میں انسان کو اپنی عقلی اور روحانی اور مادی ترقی کے لیے ایک پرسکون ماحول مل سکے' جس میں عورت اور مرد باہمی جذبات کی خلل اندازی سے محفوظ رہ کر اپنی بہترین استعداد کے مطابق اپنے اپنے تمدنی فرائض انجام دے سکیں' جس میں تمدن کا سنگ بنیاد یعنی خاندان پورے استحکام کے ساتھ قائم ہو' جس میں نسلیں محفوظ رہیں اور اختلاط انساب کا فتنہ برپا نہ ہو' جس میں انسان کی خانگی زندگی اس کے لیے سکون و راحت کی جنت اور اس کی اولاد کے لیے مشفقانہ تربیت کا گہوارہ اور خاندان کے تمام افراد کے لیے اشتراک عمل اور امداد باہمی کی انجمن ہو' تو ان مقاصد کے لیے آپ کو مغربی راستے کا رخ بھی نہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ بالکل مخالف سمت کو جا رہا ہے' اور مغرب کی طرف چل کر مشرق کو پہنچ جانا عقلاً محال ہے۔ اگر فی الحقیقت آپ کے مقاصد یہی ہیں تو آپ کو اسلام کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ (سید ابوالاعلیٰ مودودی' "فیصلہ کن سوال"' ترجمان القرآن جلد ۱۵' عدد ۶' ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ' ۱۹۴۰ء' ص ۳۹۵-۳۹۶)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

سی ٹی بی ٹی اور ہماری ایٹمی صلاحیت کا مستقبل

پروفیسر خورشید احمد

پاکستان کی ایٹمی صلاحیت ایک بار پھر معرض خطر میں ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ جس طرح آج تک اللہ تعالیٰ نے سارے خطرات اور ریشہ دوانیوں کے باوجود اس ملک کی حفاظت کی ہے اسی طرح مستقبل میں بھی وہی ہمارا محافظ' والی اور مستعان ہے۔ اور جس طرح پاکستانی عوام نے پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے سلامتی کے اس نظام کا پہلے دفاع کیا ہے اسی طرح وہ آج بھی اس کی بقا کے لیے سینہ سپر رہیں گے۔ البتہ جس بات کا بڑا قلق ہے اور اس کا اظہار بھی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس بار جن حالات میں اور جن راستوں سے یہ خطرات حملہ آور ہو رہے ہیں وہ سب سے زیادہ غیر متوقع بلکہ متحیر کن ہیں گویا:

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

لیکن الحمدللہ قوم بیدار ہے' اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی مصلحت ہے کہ کسی اقدام سے پہلے قومی بحث و مباحثے کا راستہ اختیار کیا گیا ہے جس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ نئی مہم کی سرخیل تو وزارت خارجہ ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ عوام' اور خصوصیت سے دینی قوتیں اور فوج' ملک کی قیادت کو کسی ایسے راستے پر آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیں گے جس سے ملک کی سلامتی اور پاکستان کی آزادی نئے خطرات سے دوچار ہو جائے۔ عالمی دباؤ اور معاشی مجبوریاں اپنی جگہ' لیکن قوموں کا اصل امتحان ایسے ہی حالات میں ہوا کرتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کے دور کا ہمارا ۵۲ سالہ ریکارڈ تو بہت درخشاں اور قابل فخر نہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب بھی ملک کے وجود اور قومی سلامتی کو کوئی حقیقی خطرہ پیش آیا ہے' قوم اٹھ کھڑی ہوئی ہے' اور فوج نے بھی دفاع وطن کے لیے جان کی بازی لگا دی ہے۔ بہت سے میدانوں میں ہماری کارکردگی بڑی مایوس کن رہی ہے لیکن جہاں تک جوہری صلاحیت کو ترقی دینے اور اسے دفاع وطن کے لیے ایک مؤثر سد جارحیت بنا دینے کا تعلق ہے' خدا کے فضل و کرم سے قوم' اس کی فوج اور اس کے سائنس دانوں نے ہر مشکل کا مقابلہ کر کے وہ مقام حاصل کر لیا ہے جو دشمنوں کی آنکھوں

میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے اور جس سے ہمیں محروم کرنے کے لیے نت نئے جال بچھائے جا رہے ہیں۔

۱۹۷۴ میں ہر مخالفت کے باوجود' برعظیم پر بھارت کے سیاسی اور عسکری غلبے کا راستہ روکنے کے لیے ایٹمی صلاحیت کی ترقی کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ ۱۹۷۷-۷۸ میں امریکہ' فرانس اور تمام مغربی اقوام کی جارحانہ مخالفت کے باوجود اس پروگرام کو جاری رکھا گیا۔ پھر اگلے دس سال تک امریکہ کی ان معاشی پابندیوں کو نظرانداز کر کے' جو کارٹر حکومت نے فروری ۱۹۷۹ میں مسلط کی تھیں اور جو سیمنگٹن' پریسلر اور دوسری امریکی قدغنوں کی شکل میں کسی نہ کسی طرح ہمارا راستہ روکتی رہیں' یہ قوم پوری استقامت کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن رہی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۸۴ سے ۱۹۹۹ تک کم از کم تین بار پوری تیاری اور منصوبہ بندی کے باوجود بھارت پاکستان کے خلاف جارحیت کے ارتکاب سے باز رہا۔ مئی ۱۹۹۸ کے جوہری تجربات کے بعد ہر طرح کے عالمی گھیراؤ اور دباؤ کا مقابلہ کرتے ہوئے اور اس دور کی حکومتوں کی کمزوریوں بلکہ گھٹنے ٹیک دینے کی حد تک پہنچ جانے کے باوجود اللہ کی مشیت اور عوامی دباؤ کے تحت ہر سمجھوتے سے ملک و ملت محفوظ رہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس حالیہ گھیراؤ سے بھی ہم ان شاء اللہ اسی طرح نکلنے میں کامیاب ہوں گے۔ البتہ یہ صورت حال ہمیں ایک ایسا موقع فراہم کرتی ہے کہ قوم کے سامنے سارے حقائق کو کھول کر رکھ دیں تاکہ اس قوم کا ہر فیصلہ خدا پر بھروسے کے ساتھ ملکی آزادی' سلامتی' دفاع اور عزت کے تقاضوں کو پورا کرنے والا ہو۔ جو فیصلہ بھی ہو وہ آزاد فضا میں' دلائل کی بنیاد پر' قومی مفاد میں کیا جائے۔ نہ کسی بیرونی دباؤ یا معاشی مجبوری کے تحت ہو اور نہ محض جذباتی انداز میں بنیادی اور اسٹرٹیجک اہمیت کے معاملات کو نمٹانے کی کوئی کوشش ہو۔

سب سے پہلا سوال جو غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت اس بحث کی' بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں جوہری دھماکوں پر ہمہ گیرپابندی کے اس معاہدے پر دستخطوں کے مسئلے کو اٹھانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ چیف ایگزیکٹو جناب جنرل پرویز مشرف نے ۱۲ اکتوبر کے اقدام کے بعد کئی بار اس امر کا صاف الفاظ میں اعلان کیا کہ ان کے سامنے بہت اہم اور ضروری مسائل ہیں اور وہ سی ٹی بی ٹی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتے۔ وزیر خارجہ نے بھی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد اور خصوصیت سے بھارت کے نیوکلیر نظریے کے پس منظر میں نومبر کے شروع میں اسی قومی موقف کا اعادہ کیا جو پاکستان کا اصولی موقف رہا ہے۔ لیکن دسمبر کے تیسرے ہفتے میں یکایک سی ٹی بی ٹی کے فوائد اور انعامات کا انکشاف ہو گیا اور خود وزارت خارجہ نے اس مہم کا آغاز کر دیا کہ بھارت سے پہلے پاکستان اس معاہدے کا طوق غلامی آگے بڑھ کر اپنے گلے میں ڈال لے اور سرکاری میڈیا نے حسب سابق یک طرفہ پروپیگنڈے کا اہتمام شروع کر دیا۔ شکر ہے کہ ملک میں

اظہار رائے اور صحافت کی آزادی ہے اور دینی اور سیاسی قوتیں اور علما اور دانشور اتنے بیدار ہیں کہ فوراً انھوں نے اس بحث میں حصہ لیا اور وزارت خارجہ اور اس کے حلیف اور موید دفاعی پوزیشن میں آگئے۔ جو اظہار رائے اس زمانے میں ہوا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ سی ٹی بی ٹی کے ایک فنی اور پیچیدہ معاملہ ہونے کے باوجود ملک کی عظیم اکثریت اس کے اثرات اور عواقب کا شعور رکھتی ہے اور ہر ایسے اقدام کا راستہ روکنے کے لیے مستعد ہے جو پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کو آج یا مستقبل میں کمزور کرنے والا ہو۔

لیکن یہ سوال بہرحال قابل غور ہے کہ اس خاص وقت اس مسئلے کو اٹھانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ کیا یہ تاریخ کی ستم ظریفی نہیں کہ جس وقت خود امریکہ کی سینیٹ نے سی ٹی بی ٹی کے معاہدے کی توثیق سے انکار کر دیا ہے اور امریکہ اس کے بارے میں اپنے سیاسی اور اخلاقی کارڈ سے محروم ہو گیا ہے' ہماری وزارت خارجہ اس معاہدے میں' جسے وہ خود بھی "یا مردہ ہے یا نزع کے عالم میں ہے گرفتار" کے مصداق قرار دیتی ہے اور جس کے ترجمان بار بار کہہ رہے ہیں کہ ہو سکتا ہے یہ معاہدہ کبھی بھی بروئے کار نہ آسکے' اس میں جان ڈالنے بلکہ اس کے لیے شادیانہ عروسی کا اہتمام کرنے کے لیے بے چین ہو گئے ہیں۔ اگر سی ٹی بی ٹی ایک مردہ اور بے جان معاہدہ ہے تو پھر اس سے رشتہ عروس کے لیے یہ بے چینی کیوں؟ مردہ لاش کے لیے تو بہترین سلوک اس کی تجہیز و تکفین ہے نہ کہ رشتہ ازدواج؟

آج تک کسی نے کھل کر قوم کے سامنے ان فوائد اور انعامات کا بیان نہیں کیا جو اس معاہدے پر دستخطوں سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ تین باتیں اشارتاً کہی جا رہی ہیں:

(i) معاشی پابندیاں ختم ہو جائیں گی اور سرمایہ کاری کی سہولتیں بڑھ جائیں گی۔

(ii) پاکستان کو بھارت پر اخلاقی برتری حاصل ہو جائے گی اور عالمی برادری سے تعلقات بہتر ہوں گے۔ نیز تنہائی کی سی جو کیفیت پیدا ہو گئی ہے' وہ دور ہو جائے گی۔

(iii) صدر کلنٹن اپنے جنوبی ایشیا کے متوقع دورے میں پاکستان کو شامل کر سکیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں باتوں میں کوئی وزن نہیں۔ معاشی دباؤ کا آغاز ۱۹۷۶ سے ہوا ہے جب سی ٹی بی ٹی کا کوئی وجود بھی نہیں تھا۔ بین الاقوامی سیاست میں تنہائی اور دوستی حالات اور مفادات پر موقوف ہیں۔ سرد جنگ کے دور میں اور خصوصیت سے افغان جہاد کے دوران ہماری اسٹریٹجک اہمیت کے پیش نظر مغربی اقوام کا رویہ دوسرا تھا اور حالات کے بدلتے ہی ان کی نظریں بھی بدل گئیں۔ صدر کلنٹن کے دورے کی اہمیت بجا' مگر صدارت کے آخری سال میں ان کی جو کیفیت ہے' اس کے پیش نظران سے کوئی بڑی توقع وابستہ کرنا خیالی پلاؤ پکانے کے مترادف ہو گا۔ وہ خود سارا زور لگانے کے باوجود اپنی سینیٹ سے اس معاہدے کی توثیق نہیں کرا سکے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ یہ عدم توثیق محض داخلی سیاست کا شاخسانہ ہے۔ امریکہ کی تاریخ میں اس صدی میں یہ دوسری بار ہے کہ سینیٹ نے ایک بین الاقوامی معاہدے کو صدر کے دستخطوں کے بعد

اس طرح رد کیا ہو۔ پہلی مثال ۱۹۹۹ کے معاہدہ وارسائی کی عدم توثیق تھی اور دوسری یہ ہے۔ سینیٹ میں اس معاہدے کو شرمناک شکست ہوئی ہے' اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ توثیق کے لیے دو تہائی اکثریت کی ضرورت ہوتی ہے' اسے معمولی اکثریت بھی نہیں مل سکی۔ ۵۱ ووٹ اس کے خلاف تھے اور ۴۹ اس کے حق میں۔ یہ بھی غلط ہے کہ سب ریپبلی کنز نے اس کے خلاف ووٹ دیا۔ چند ریپبلی کن سینیٹرز نے اس کے حق میں بھی ووٹ دیا جس کے معنی یہ ہیں کہ پارٹی کی بنیاد پر ووٹ نہیں دیا گیا۔ ایک سال سے زیادہ عرصے تک سینیٹ کی مختلف کمیٹیوں میں اس پر بحث ہوتی رہی ہے اور ملک میں بھی ہر سطح پر بحث و مباحثہ کا بازار گرم تھا۔ فیصلہ اس کے بعد ہوا ہے۔ پھر یہ بھی سامنے رہنا چاہیے کہ امریکی کانگریس کے دونوں ایوانوں میں ریپبلی کن پارٹی کو اکثریت حاصل ہے جسے وہ پچھلے دس سال سے زیادہ عرصے سے برقرار رکھے ہوئے ہے اور آیندہ کے لیے پیش گوئی بھی یہی ہے کہ اکثریت اسی پارٹی کی ہو گی' بلکہ صدارت کے بارے میں بھی اسی نوعیت کے اندازے ہیں۔ ان حالات میں صدر کلنٹن کے دورے کی برکات اور اس سے حاصل ہونے والے فوائد خیالی زیادہ اور حقیقی کم ہیں۔

اس اندازِ فکر کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ قوم کی توجہ' اور خود پالیسی ساز اداروں کی بحث و گفتگو کا محور' وقتی اور نمایشی چیزیں بن جاتی ہیں اور اصل مسئلہ آنکھوں سے پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ اصل مسئلہ نہ صدر کلنٹن کا دورہ ہے' نہ معاشی پابندیاں اور دباؤ' اور نہ ہی دوستی اور تعلقات میں گرمی سردی--- اصل مسئلہ پاکستان کے اپنے مقاصد' ترجیحات اور اہداف کا ہے' اس کی سلامتی اور مفادات کا ہے' اس کے عزائم اور اس کے عوام کی تمناؤں' آرزوؤں اور شعور منزل کا ہے۔ سارے فیصلے اسی فریم ورک میں ہونے چاہییں۔ اس سے ہٹ کر کوئی اور راستہ خیر اور فلاح کا راستہ نہیں ہو سکتا۔

جوہری دھماکوں پر ہمہ گیر پابندی کا معاہدہ (Comprehensive Test Ban Treaty) کوئی ایسا معاہدہ نہیں ہے جس کا کوئی مالہ وماعلیہ نہ ہو اور ہر پس منظر سے ہٹ کر جس کی کوئی مستقل بالذات حیثیت ہو۔ یہ محض ایک تکنیکی معاملہ بھی نہیں ہے جیسا کہ وزارت خارجہ کے ترجمانوں نے دعویٰ کیا ہے۔ یہ ایک بڑے ہی بنیادی مسئلے سے متعلق ایک دستاویز ہے۔ اصل مسئلہ محض دھماکوں پر پابندی کا نہیں بلکہ اصل مسئلہ جوہری صلاحیت کا ہے۔ یہ معاہدہ تو اس کے صرف ایک جزوی پہلو سے متعلق ہے اور اسے بنیادی جوہری صلاحیت سے غیر متعلق بنا کر پیش کرنا نہ علمی دیانت ہے اور نہ پالیسی سازی کا صحیح اسلوب۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ پہلے سی ٹی بی ٹی کی اصل نوعیت اور عالمی جوہری ڈاکٹرین (global nuclear doctrine) میں اس کا مقام متعین کر لیا جائے اور یہ کام پوری علمی دیانت اور سائنسی تیقن (scientific precision) کے ساتھ کیا جائے تاکہ کوئی ابہام نہ رہ جائے۔ قوموں کی قسمت کے فیصلے سہل انگاری کے

حکمت مودودیؒ

زندگی کی ضمانت

پچھلی انسانی تاریخ میں جتنی قومیں بھی تباہ ہوئی ہیں ان سب کو جس چیز نے گرایا وہ یہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کیا تو وہ خوش حالی کے نشے میں مست ہو کر زمین میں فساد برپا کرنے لگیں اور ان کا اجتماعی ضمیر اس درجہ بگڑ گیا کہ یا تو ان کے اندر ایسے نیک لوگ باقی رہے ہی نہیں جو ان کو برائیوں سے روکتے' یا اگر کچھ لوگ ایسے نکلے بھی تو وہ اتنے کم تھے اور ان کی آواز اتنی کمزور تھی کہ ان کے روکنے سے فساد نہ رک سکا۔ یہی چیز ہے جس کی بدولت آخر کار یہ قومیں اللہ تعالیٰ کے غضب کی مستحق ہوئیں' ورنہ اللہ کو اپنے بندوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے کہ وہ تو بھلے کام کر رہے ہوں اور اللہ ان کو خواہ مخواہ عذاب میں مبتلا کر دے---- اس ارشاد سے یہاں تین باتیں ذہن نشین کرنی مقصود ہیں۔

ایک یہ کہ ہر اجتماعی نظام میں ایسے نیک لوگوں کا موجود رہنا ضروری ہے جو خیر کی دعوت دینے والے اور شر سے روکنے والے ہوں۔ اس لیے کہ خیر ہی وہ چیز ہے جو اصل میں اللہ کو مطلوب ہے' اور لوگوں کے شرور کو اگر اللہ برداشت کرتا بھی ہے تو اس خیر کی خاطر کرتا ہے جو ان کے اندر موجود ہو' اور اسی وقت تک کرتا ہے جب تک ان کے اندر خیر کا کچھ امکان باقی رہے۔ مگر جب کوئی انسانی گروہ اہل خیر سے خالی ہو جائے اور اس میں صرف شریر لوگ ہی باقی رہ جائیں' یا اہل خیر موجود ہوں بھی تو کوئی ان کی سن کر نہ دے اور پوری قوم کی قوم اخلاقی فساد کی راہ پر بڑھتی چلی جائے' تو پھر خدا کا عذاب اس کے سر پر اس طرح منڈلانے لگتا ہے جیسے پورے دنوں کی حاملہ کہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کب اس کا وضع حمل ہو جائے۔

دوسرے یہ کہ جو قوم اپنے درمیان سب کچھ برداشت کرتی ہو مگر صرف انھی چند گنے چنے لوگوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو جو اسے برائیوں سے روکتے اور بھلائیوں کی دعوت دیتے ہوں' تو سمجھ لو کہ اس کے برے دن قریب آ گئے ہیں' کیونکہ اب وہ خود ہی اپنی جان کی دشمن ہو گئی ہے۔ اسے وہ سب چیزیں تو محبوب ہیں جو اس کی ہلاکت کی موجب ہیں اور صرف وہی ایک چیز گوارا نہیں ہے جو اس کی زندگی کی ضامن ہے۔

تیسرے یہ کہ ایک قوم کے مبتلائے عذاب ہونے یا نہ ہونے کا آخری فیصلہ جس چیز پر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں دعوت خیر پر لبیک کہنے والے عناصر کس حد تک موجود ہیں۔ اگر اس کے اندر ایسے افراد اتنی تعداد میں نکل آئیں جو فساد کو مٹانے اور نظام صالح کو قائم کرنے کے لیے کافی ہوں تو اس پر عذاب عام

ممالک کے حق اور ان ہی کی بالادستی کو منظور کرلیا گیا اور امید دلائی گئی کہ ۲۵ سال میں ان مقاصد کو حاصل کرلیا جائے گا۔ لیکن عمل کے میدان میں ان پانچ ملکوں نے اپنے اپنے وسائل اور عزائم کے مطابق جوہری اسلحہ بندی کی اور بموں کے انبار لگا لیے جو ایک وقت میں ۷۰ ہزار کی تعداد سے بھی متجاوز ہو گئے۔ لیکن دوسرے ملکوں سے جو وعدہ پرامن جوہری صلاحیت کی فراہمی کا کیا گیا تھا وہ پورا نہیں کیا گیا۔ نیز غیر قانونی طور پر اپنے اپنے منظور نظر ممالک کو جوہری صلاحیت کو ترقی دینے کے مواقع فراہم کیے گئے۔

جب ۱۹۹۵ میں این پی ٹی کی تجدید کا وقت آیا اور بڑی جوہری طاقتوں کے دوغلے پن کے خلاف آواز بلند کی گئی تو ایک نئے جال کے دروبست تیار کیے گئے۔ مئی ۱۹۹۵ میں این پی ٹی کو غیر محدود عرصے کے لیے توسیع دے دی گئی اور مخالفت کو قابو میں رکھنے کے لیے دو اہم فیصلے کیے گئے یعنی ہر دس سال کے بعد ایک جائزہ کانفرنس کا انعقاد اور دوسرے' مستقبل کے لیے نئے نظام کی تشکیل۔ اس دوسرے فیصلے کے تحت بہت سے اقدامات ہیں جو فوری اہداف کے طور پر کیے گئے۔

یہ تین نکاتی پروگرام مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل تھا:

(الف) جوہری دھماکوں پر ہمہ گیر پابندی کا معاہدہ (سی ٹی بی ٹی) جسے ۱۹۹۶ کے آخر تک مکمل ہو جانا تھا۔

(ب) جوہری مواد کی افزودگی پر پابندی اور جوہری ہتھیاروں کے بنائے جانے کی روک تھام کا معاہدہ (ایف ایم سی ٹی)

اور (ج) نیوکلیر ہتھیار رکھنے والی ریاستوں کا ایسے ہتھیاروں کی تعداد کو کم کرنے کا عزم اور دعویٰ۔

یہ تینوں اقدام این پی ٹی کی توسیع اور اس کے تحت قائم ہونے والے عالمی جوہری نظام کا حصہ ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ گو دعویٰ کیا گیا ہے کہ سی ٹی بی ٹی اور موعود ایف ایم سی ٹی ملکوں کے درمیان کسی امتیاز (discrimination) پر مبنی نہیں ہوں گے اور اصولی طور پر تمام ملکوں پر مساوی حیثیت سے لاگو ہوں گے۔ لیکن یہ محض ایک مغالطہ ہے اس لیے کہ یہ دونوں ضمنی معاہدے این پی ٹی کے ہمہ گیر نظام کا حصہ ہیں اور عالمی سطح پر نیوکلیر تفریق (aparthied) کو مستقل بنانے کا ذریعہ ہیں۔

اصل ہدف جوہری ہتھیاروں کا خاتمہ اور دنیا کو ان سے پاک کرنا تھا مگر مغربی اقوام اور خصوصیت سے امریکہ اور روس نے سارا زور اس پر لگا دیا کہ:

اول: جوہری سد جارحیت باقی رہے اور اس پر ایٹمی ہتھیار رکھنے والی اقوام کا اجارہ رہے۔

دوم: دوسرے تمام ممالک کی ایٹمی استعداد اسی مقام پر منجمد ہو جائے جہاں وہ کسی معاہدے کے تحت تھے۔

سوم: آیندہ کے لیے کسی چیلنج کرنے والی قوت کے ابھرنے کے امکان کو ختم کر دیا جائے۔

چہارم: ایٹمی قوت کے پرامن استعمال کا جو راستہ شروع میں کھلا رکھا تھا' اسے بھی محدود رکھا جائے اور

عملاً ایٹمی ممالک کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ این پی ٹی میں پُرامن استعمال کو ہر ملک کا ایک ناقابل تنسیخ حق قرار دیا تھا۔ دفعہ IV میں کہا گیا ہے:

> اس معاہدے کی کسی بات کو معاہدے کے تمام فریقین کے پرامن مقاصد کے لیے جوہری توانائی کی ترقی' تحقیق' پیداوار اور استعمال کے غیر مبدل حق پر اثرانداز ہونے کے مفہوم میں نہیں لیا جائے گا۔

اس میں تعاون کا وعدہ کیا گیا تھا اور اسے جوہری طاقت والے ممالک کی ذمہ داری قرار دیا گیا تھا۔ اب بعد کے معاہدات کے ذریعے اسے عملاً ختم کر دیا گیا ہے۔ گویا جس بات کو غیر امتیازی کہا جا رہا ہے وہ دراصل پرامن استعمال کے لیے تحقیق اور ترقی کے حق سے محرومی ہے:

تغافل سے جو باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی!

سی ٹی بی ٹی کا این پی ٹی اور پورے عالمی نیوکلیر نظام سے تعلق صرف تاریخی پس منظر سے نہیں ہے بلکہ خود سی ٹی بی ٹی میں' خصوصیت سے اس کے دیباچہ (preamble) میں پانچ بار صرف جوہری عدم پھیلاؤ ہی نہیں بلکہ مکمل تخفیف اسلحہ کا ذکر ہے جسے بڑی ہوشیاری سے آرٹیکل VIII-1 میں خود سی ٹی بی ٹی کا مقصد اور ہدف قرار دیا گیا ہے۔ بظاہر یہ معاہدہ صرف جوہری دھماکے کے بارے میں ہے لیکن فی الحقیقت اس کا مقصد جوہری ہتھیاروں کی صلاحیت کو ختم کرنا ہے جس کا ہدف یہ ۵ نہیں' باقی ممالک بنیں گے جنھیں این پی ٹی جوہری ہتھیار بردار ملک تسلیم نہیں کرتی۔ اس بات کا ذکر شروع میں نہیں کیا گیا لیکن معاہدے کے جائزہ (review of the treaty) کے باب میں یہ نکتہ رکھ دیا گیا ہے کہ دس سال کے بعد ایک کانفرنس ہو گی:

> اس معاہدے پر عمل اور اس کی اثراندازی کا جائزہ لینے کے لیے' تاکہ یہ یقین حاصل کیا جا سکے کہ اس معاہدے کے دیباچے اور دفعات میں مذکور مقاصد اور اہداف حاصل کیے جا رہے ہیں (آرٹیکل VIII - 1)

سی ٹی بی ٹی کا مسودہ بڑی ہوشیاری' عیاری اور چابک دستی سے تیار کیا گیا ہے اور اس میں اتنے ابہام رکھ دیے گئے ہیں کہ ایک بار ایک ملک اس میں شریک ہو جائے پھر وہ بڑی طاقتوں کے رحم و کرم پر ہو گا جو ایک خودکار انتظامی مشینری کے ذریعے اپنی من مانی کرا سکیں گی۔ ۵۱ ممالک پر مشتمل ایگزیکٹو کمیٹی دو تہائی کی اکثریت سے ہر فیصلہ کر سکے گی اور کمزور ممالک اس کے آگے اسی طرح دم بخود ہوں گے جس طرح عراق اقوام متحدہ کی نام نہاد تحقیقاتی ٹیم کے سامنے تھا۔ اس معاہدے کی مختلف شقوں کی تعبیر کا حق بھی اسی

کمیٹی کو ہے۔

سی ٹی بی ٹی کا مکمل متن گہرے غور و مطالعہ اور تجزیہ و تحلیل کا تقاضا کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ امریکہ کی سینیٹ نے اس کی توثیق کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس میں جو خطرات مضمر ہیں ان میں سے چند بڑے بڑے یہ ہیں:

۱۔ معاہدے کا عنوان (title) جوہری ٹیسٹ کو اپنی تمام ہمہ گیری کے ساتھ اپنا ہدف قرار دیتا ہے۔ معاہدے کی دفعہ ۱ میں لفظ آزمائشی دھماکے (test explosion) اور دوسرے جوہری دھماکے (other nuclear explosion) استعمال کیا گیا ہے جب کہ test اور explosion کی کوئی واضح تعریف نہیں کی گئی ہے۔ یہ اتفاقی صورت نہیں ایک سوچی سمجھی چال ہے تاکہ آیندہ کیا چیز test ہے اور کیا نہیں ہے، اسے تعبیر کے نام پر ایگزیکٹو کمیٹی کی صواب دید قرار دیا جا سکے۔

۲۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جوہری ہتھیاروں کے آزمائشی دھماکوں پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے ساتھ دوسرے جوہری دھماکوں کی بہت ہی مبہم اصطلاح استعمال کی گئی ہے جسے دیباچہ اور اس میں جوہری تخفیف اسلحہ کے بار بار کے استعمال کی روشنی میں بہت مختلف معنی دیے جا سکتے ہیں۔

۳۔ معاہدے میں سب سے خطرناک چیز پورے جوہری نظام کی معلومات کو اس عالمی نظام کا حصہ بنانا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ملک کو اپنی تمام استعدادی صلاحیتوں سے اس نظام کو باخبر کرنا ہو گا جو ۳۰۰ سے زیادہ تفتیش گاہوں کی شکل میں قائم کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد کوئی بھی چیز قومی راز نہیں رہ سکے گی۔ نام ٹیسٹ اور دھماکوں کی نگرانی کا ہے مگر دراصل یہ ایٹمی تحقیق اور صلاحیت کار کی پوری نگرانی کا ایک ہمہ گیر نظام ہے جس کے چنگل سے کوئی نہیں بچ سکے گا۔

۴۔ اس معاہدے کا مرکزی تصور صرف تفتیش اور حصول معلومات کا فنی اور تکنیکی نظام نہیں، بلکہ بر سر زمین معائنے کا ایک خطرناک نظام ہے جس کی گرفت میں آنے کے بعد کوئی چیز بھی محفوظ نہیں رکھی جا سکے گی۔ کہا جا رہا ہے کہ اس کا تعلق صرف اس جگہ سے ہو گا جہاں ٹیسٹ کا شبہ ہو اور وزارت خارجہ کے ایک ترجمان نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ یہ صرف پانچ چھ میل کا معاملہ ہے۔ اصل متن کا اگر بغور مطالعہ کریں تو اس میں علاقے کی وسعت ایک ہزار مربع کلومیٹر اور کسی ایک سمت میں مسلسل ۵۰ کلومیٹر کا تعین موجود ہے (Protocol of the CTBT - Part II A.3)۔

اسی طرح اس معاہدے میں ایک تفتیشی عمل کی مدت ۶۰ دن ہے، جسے ۷۰ دن تک توسیع دی جا سکتی ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر اس میں صرف معائنہ ہی نہیں بلکہ دفعہ ۵۸ - IV اور دفعہ ۴۸ کے مطابق مداخلتی طریقوں (intrusive manners) کا اختیار بھی لیا گیا ہے، گو بڑی ہوشیاری کے ساتھ۔ بر سر موقع معائنہ کی وسعت اور کیفیت کا اندازہ ان اختیارات سے لگایا جا سکتا ہے:

The sole purpose of an on-site inspection shall be to clarify wheather a nuclear weapon test explosion or any other nuclear explosion has been carried out in violation of Article I, and to the extent possible to gather any facts which might assist in identifying any possible violation.

برسرموقع معائنے کا واحد مقصد یہ ہو گا کہ واضح ہو سکے آیا جوہری اسلحے کا ایک آزمایشی دھماکا یا کوئی دوسرے جوہری دھماکے دفعہ ا کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کیے گئے ہیں؟ اور جہاں تک ممکن ہو، ان حقائق کو جمع کرنا، جو کسی ممکنہ خلاف ورزی کے تعین میں مددگار ہو سکیں۔

آخری جملے میں جو وسعت ہے اس کے خوف ناک احتمالات کو نظرانداز کرنا بہت بڑی حماقت ہو گی۔

مداخلتی معائنہ (intrusive inspection) کا دروازہ اس طرح کھولا گیا ہے:

برسرموقع معائنہ کم سے کم مداخلتی انداز سے کیا جائے گا جو معائنے کے مینڈیٹ کی بروقت اور مؤثر تکمیل پر مبنی ہو گا۔ جہاں تک ممکن ہو گا معائنہ ٹیم کم سے کم مداخلتی طریقہ کار سے آغاز کرے گی اور پھراس کے بعد معتدبہ معلومات جمع کرنے کے لیے جہاں تک ضروری سمجھے گی زیادہ مداخلتی طریقے اختیار کرے گی تاکہ اس معاہدے کی ممکنہ پابندی نہ کرنے کے بارے میں تشویش پر اطمینان حاصل کیا جا سکے۔

سوال یہ ہے کہ اس حق کو دے دینے کے بعد آپ اپنی کس تنصیب کو اس عالمی ٹیم کی چیرہ دستی سے محفوظ رکھ سکیں گے؟

۵۔ کہا جا رہا ہے کہ ہم کچھ شرائط امریکہ سے منوا لیں گے۔ لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ امریکہ سے اگر آپ کچھ شرائط منوا بھی لیں تو ان کی قانونی حیثیت کیا ہے؟ امریکہ تو خود اپنی شرائط تسلیم نہیں کرا سکا اور صدر کلنٹن نے جو ۶ نکاتی تحفظاتی نظام تجویز کیا تھا وہ بھی امریکی سینیٹ کو مطمئن نہیں کر سکا۔ کیمیائی اسلحے کے سلسلے میں امریکی کانگریس نے جو تحفظاتی قانون منظور کیا ہے وہ محض اپنے عالمی طاقت ہونے کے زعم میں کیا ہے ورنہ معاہدے میں اس کی گنجایش نہیں۔ معاہدے میں دفعہ XV میں صاف کہہ دیا گیا ہے کہ:

The Articles and the Annexures to this Treaty shall not be subject to reservation.

اس معاہدے کی دفعات اور ضمیمے کسی تحفظ سے مشروط نہ ہوں گے۔

نیز معاہدے کے پروٹوکول اور ضمیموں کے بارے میں بھی تحفظات ماننے یا نہ ماننے کا اختیار ملک کو نہیں معاہدے کی انتظامیہ کو ہے جو معاہدے کے مقاصد سے تصادم کی بنیاد پر تحفظات کو رد کر سکتی ہے۔

۶۔ کہا جا رہا ہے کہ اگر بھارت نے دھماکا کیا تو ہم بھی کریں گے۔ لیکن کس قانون کے تحت؟ سی ٹی بی ٹی تو اس کا دروازہ کلی طور پر بند کر دیتی ہے۔ رہا معاہدے سے علیحدگی (withdrawal) کا اختیار، تو وہ

بھی محل نظر ہے۔ ایک تو اس کے لیے ٦ ماہ کا نوٹس ضروری ہے۔ دوسرے' نوٹس دینے کے معنی یہ ہیں کہ اس عرصے میں آپ اپنے کو دشمن کے حملے کے لیے نرم نوالہ بناتے ہیں کہ آپ کے اعلان سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ آپ دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں اور آپ کا سدجارحیت مؤثر نہیں ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر آپ اپنے کو عالمی دباؤ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔ شمالی کوریا نے این پی ٹی سے علیحدہ ہونے کے عندیہ کا اظہار کیا اور امریکہ نے اس کی فوری ناکہ بندی کر کے اسے اس ارادے سے باز رکھا۔ عراق بھی معاہدے سے نکلنا چاہتا تھا مگر کس نے نکلنے دیا۔ جب آپ معاہدے میں شریک نہیں ہیں اور دباؤ آپ کے لیے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے تو ایک بار اس میں داخل ہونے کے بعد نکلنے کا کیا سوال؟ سیدھی سیدھی بات یہ ہے کہ:

جس کو ہو دین و دل عزیز' اس کی گلی میں جائے کیوں

ہم نے سی ٹی بی ٹی کے کچھ پہلوؤں پر جو گفتگو کی ہے اس سے اس دعوے کا پول کھل جاتا ہے کہ یہ تو محض دھماکوں کے بارے میں ہے اور کوئی ایسی مضرت رساں چیز نہیں۔ لیکن اصل مسئلہ اس سے بھی زیادہ بنیادی ہے اور وہ یہ کہ اگر ہمارے ملک کے لیے ایٹمی سدجارحیت ضروری ہے اور چیف ایگزیکٹو اور وزیر خارجہ دونوں بار بار اعلان کر رہے ہیں کہ جوہری دفاعی صلاحیت ناگزیر ہے تو پھر غور کرنے کا سوال یہ ہے کہ کیا جوہری سدجارحیت ایک جامد (static) تصور ہے یا یہ ایک تغیرپذیر حقیقت ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ علاقے کے بدلتے ہوئے حالات اور خطرات کی روشنی میں اس سدجارحیت کو مسلسل ترقی دی جاتی رہے یعنی اسے up-grade اور upto date کیا جائے۔ اور کیا ٹیسٹ کے بغیر جدید ترین سطح تک لانے کے لیے ضروری اقدام ممکن ہے؟

ہم اسلحے کی کسی دوڑ کے قائل نہیں' نہ روایتی اور نہ جوہری۔ نہ اس کی ضرورت ہے اور نہ ہی ہم اس کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ البتہ دفاعی قوت کا حصول جو دشمن کو قرار واقعی سبق سکھا سکے اور جو اسے جارحیت سے روک سکے' ہماری ناقابل تخفیف ضرورت ہے۔ اس کو کم سے کم مؤثر سدجارحیت کہا جاتا ہے۔ اور یہ ایک اضافی تصور ہے جسے موجود اور مستقبل کے خطرات کی روشنی میں متعین کیا جاتا ہے۔ اب ہماری صورت حال یہ ہے کہ روایتی جنگی سروسامان کے باب میں بھارت ہم سے کئی گنا زیادہ قوت رکھتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس کی بری فوجی قوت ہم سے چار گنا زیادہ ہے' ہوائی قوت سات گنا زیادہ اور بحری جنگ کی قوت کم از کم گیارہ گنا اور ایک اندازے کے مطابق سترہ گنا زیادہ ہے۔ ان حالات میں ہماری دفاعی قوت کا بڑا انحصار جوہری سدجارحیت پر ہو گا اور ہے۔ خیال رہے بھارت کا جوہری ڈھانچا (establishment) ہم سے پرانا ہے اور بڑا بھی اور صلاحیت کار میں بھی غالباً ایک اور چار کی نسبت ہے۔

اس کے باوجود جو استعداد ہمیں اس وقت حاصل ہے وہ وقتی طور پر مؤثر سدجارحیت فراہم کرتی ہے۔ بھارت نے اب جو نیوکلیر ڈاکٹرین پیش کیا ہے اور جو اس کے عسکری نظام میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور جس پر اگلے دس سالوں میں پندرہ بلین ڈالر سے زیادہ خرچ ہوں گے اس نے علاقے کے توازن کو تبدیل کر دیا ہے۔ ہمارے لیے ناگزیر ہو گیا ہے کہ اپنی استعداد کو بڑھانے کی فکر کریں۔ برابری نہ مطلوب ہے اور نہ ضروری، لیکن صحیح تناسب ضروری ہے اور وہ مزید تجربات اور نئی ٹکنالوجی سے فائدہ اٹھائے بغیر ممکن نہیں۔

جوہری سائنس دانوں اور فوجی ماہرین سے تبادلہ خیال، متعلقہ لٹریچر کے مطالعے اور امریکی سینیٹ میں سی ٹی بی ٹی کی بحثوں پر ماہرین کی آرا کے تجزیے سے ہم جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ جوہری تجربات کا دروازہ بند کرنا قومی خودکشی کے مترادف ہو گا۔ الحمدللہ ہمارے پاس وہ صلاحیت اور وسائل موجود ہیں جن سے ہم اپنی جوہری صلاحیت کو مقابلے کے لیے تیار رکھ سکتے ہیں۔ اس کے لیے صرف تحقیق ہی نہیں، تجربے کا عمل جاری رکھنا بھی ضروری ہے۔ جو قوت ہمیں حاصل ہے وہ فوری خطرات کے لیے کافی ہے لیکن اس میں اضافہ اور خصوصیت سے اس کی جدید کاری (modernization) کی مسلسل ضرورت ہے جس سے اغماض برتنا بے حد خطرناک ہو سکتا ہے۔ ٹیسٹ کی ضرورت دسیوں وجوہ سے ہو سکتی ہے۔ ہمارے سائنس دانوں نے چودہ امکانی ضروریات کی نشاندہی کی ہے (ملاحظہ ہو ڈاکٹر سلطان بشیرالدین محمود اور محمد نسیم کا مضمون جو برطانیہ کے رسالے امپیکٹ انٹرنیشنل (جولائی ۱۹۹۹) میں شائع ہوا اور جسے دی نیشن اور نوائے وقت نے حال ہی میں دوبارہ شائع کیا ہے)۔

لیکن ہماری نگاہ میں جوہری قوت کے پرامن استعمال کے لیے کیے جانے والے تجربات کے علاوہ خالص دفاعی نقطۂ نظر سے کم از کم چار ایسی ضرورتیں ہیں جن کی وجہ سے ہم کسی قیمت پر بھی اپنے اس حق سے دستبردار نہیں ہو سکتے:

۱۔ اسلحہ کاری (Weaponization) جس کے بغیر سدجارحیت محض ایک خیالی چیز رہتی ہے۔

۲۔ تصغیر (Miniaturization) جس کے ذریعے زیادہ درستگی (precesion) حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ پورے پراجیکٹ کو کم خرچ بنانے کے لیے ضروری ہے۔ ان سب سے بڑھ کر اس کے ذریعے جوہری اسلحہ کو ہدف کے لیے زیادہ سے زیادہ مؤثر بنایا جا سکتا ہے اور تاب کاری کے اثرات کو محدود کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ حر مرکزائی (Thermo Nuclear) میدان میں پیش رفت جو مقابلے کی قوت کے لیے ضروری ہے۔

۴۔ جوہری اسلحے اور ہدف پر مار کرنے کے نظام (delivery system) میں ہم آہنگی پیدا کرنا۔

ان کے علاوہ ایک اہم مسئلہ ٹکنالوجی کی نئی ترقی اور اس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے جس میں نتائج کو حتمی بنانے کے لیے عملی تجربات ناگزیر ہیں۔

بھارت کے نیوکلیر ڈاکٹرین کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میزائل شکن ٹکنالوجی اور نیوکلیر ہتھیاروں کو غیر مؤثر کرنے کے انتظامات پر کام کر رہا ہے۔ اس سے سدجارحیت کے نئے اور اہم تقاضے سامنے آتے ہیں۔ یہ بھی نئی تحقیق اور تجربات کا متقاضی ہے۔ ایک حملے کو سہ جانے کی صلاحیت اور اس کے بعد دوسرا حملہ کرنے کی قوت کی موجودگی بھی نیوکلیر سدجارحیت کا اہم حصہ ہے۔ یہ وہ تمام پہلو ہیں جن کا خاطر خواہ احاطہ عالمی ایٹمی جال سے بچے بغیر ممکن نہیں۔ نہ ہم نے این پی ٹی پر دستخط کیے ہیں اور نہ ہی سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے چاہییں۔ ایف ایم سی ٹی پر بات چیت شوق سے کریں مگر اپنے ترقیاتی عمل کو جاری رکھیں اور کوئی موقع مغربی اقوام کو فراہم نہ کریں کہ وہ ہمارے نظام کو اپنی گرفت میں لینے میں کامیاب ہو سکیں۔

ہمارے ہاں جو دانش ور ایٹمی صلاحیت کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے ان کی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کر دو۔ لیکن وہ حضرات جو سدجارحیت کے قائل ہیں اور وہ فوجی قیادت جو جانتی ہے کہ سدجارحیت کی موثر صلاحیت کے بغیر دشمن کو جارحیت سے روکنا ممکن نہیں' ان عناصر کی طرف سے سی ٹی بی ٹی کی تائید یا اس سلسلے میں کسی کمزوری اور خاموشی کا رویہ ناقابل فہم اور ناقابل توجیہہ ہے۔

وطن عزیز کے جو عناصر جوہری صلاحیت کی حفاظت اور ترقی کو ملک کی سلامتی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں ہم پوری دردمندی کے ساتھ ان سب سے اپیل کرتے ہیں کہ سی ٹی بی ٹی کے کھیل کو سمجھیں اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جو اپنی تباہی کو دعوت دینے کے مترادف ہو۔

پاکستان واحد مسلمان ملک ہے جس نے ایٹمی صلاحیت حاصل کر لی ہے۔ صرف پاکستان ہی کا نہیں پوری امت مسلمہ کا ہم پر حق ہے اور ہمارا مستقبل اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ افسوس ہے کہ مسلم ممالک نے اس پورے عرصے میں بالغ نظری کا ذرا بھی ثبوت نہ دیا اور جو خطرات خود اس کے وجود کو اسرائیل' بھارت اور امریکہ سے ہیں ان کو یکسر نظرانداز کر کے این پی ٹی اور سی ٹی بی ٹی پر دستخط کر دیے۔ حالانکہ امت مسلمہ کی حیثیت سے ہمارا موقف یہ ہونا چاہیے کہ یا تمام ایٹمی ہتھیاروں کو ختم کرو اور دنیا کو مکمل طور پر ایٹمی ہتھیاروں کی تباہ کاری سے محفوظ رکھو ورنہ جو حق اپنے لیے حاصل کر چکے ہو' اسے ہمارے لیے بھی تسلیم کرو۔ آج کی دنیا میں توازن قوت ایٹمی سدجارحیت پر مبنی ہے اور اگر عالم اسلام اس قوت سے محروم رہتا ہے تو وہ دوسروں کے رحم و کرم پر رہے گا۔ پاکستان نے اللہ کے فضل سے اس اجارہ داری کی

زنجیر کو توڑا ہے۔ اب ہم سب کا فرض ہے کہ اس قوت کی حفاظت کریں اور عالمی توازن قوت میں اپنا مقام پیدا کریں۔ اگر پاکستان بیرونی دباؤ یا معاشی مشکلات سے مجبور ہو کر اپنے قدم پیچھے ہٹا لیتا ہے تو یہ پاکستان ہی نہیں پورے عالم اسلام کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ ہو گا۔ مسلمانوں کو سر جوڑ کر امت کے مفاد میں ان مسائل پر غور کرنا چاہیے اور اس کے لیے مناسب حکمت عملی تیار کرنی چاہیے۔

پاکستان ان خطرات کو ایک لمحے کے لیے بھی نظرانداز نہیں کر سکتا جو اسے بھارت کی طرف سے درپیش ہیں اور خصوصیت سے بھارت کشمیر میں جو مظالم ڈھا رہا ہے اور اس پر اپنے ناجائز قبضے کو محض قوت کے بل بوتے پر دوام بخشنے کے منصوبے پر عمل پیرا ہے اسے برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان کے ایٹمی ڈاکٹرین کو عالمی سطح پر غیر امتیازی رویے (non - discrimination) اور علاقائی سطح پر بھارت سے درپیش خطرات سے غیر مربوط (de-link) نہیں کیا جا سکتا۔ کشمیر کے مسئلے کے منصفانہ حل سے بھی اس کا گہرا ربط ہے۔ عالم اسلام کے اتحاد اور اس کے عالمی کردار سے بھی اسے منقطع نہیں کیا جا سکتا۔ بھارت نے اس سلسلے میں جو قلابازیاں کھائی ہیں اور جس طرح سودے بازی کر رہا ہے ہم اسے بھی نظرانداز نہیں کر سکتے۔ فوج اور عوام میں جو رشتہ اعتماد اور تعاون ہے وہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ہماری قومی سلامتی کی حکمت عملی کو ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا چاہیے۔ معاشی حالات کی خرابی کو' قومی مفاد کو پس پشت ڈالنے کے لیے' وجہ جواز نہیں بنایا جا سکتا۔ قوم کو بیدار کرنا اور معاشی چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے سب کو سرگرم عمل کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ لیکن معاشی مشکلات کے نام پر دنیا میں امریکہ کی اور علاقے میں بھارت کی بالادستی کے نظام کو قبول کر لینا اس غیور اور صاحب ایمان قوم کے لیے ہرگز ممکن نہیں جس نے انگریز اور ہندو قیادت دونوں کے خلاف ایک تاریخی جدوجہد میں بیش بہا قربانیاں دے کر آزادی حاصل کی۔ آج وہی آزادی معرض خطر میں ہے۔ ہماری موجودہ قیادت اگر قوم کے حقیقی جذبات نہیں سمجھ رہی تو بڑی خطرناک غلطی کی مرتکب ہو رہی ہے۔ ماضی کی نام نہاد جمہوری اور درحقیقت مفاد پرست قیادتیں بھی قوم کے حقیقی مفاد پر سمجھوتہ کرنے کو تیار تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے عزائم کو خاک میں ملا دیا اور انھیں دوسروں کے لیے نشان عبرت بنا دیا۔ ہمارا مشورہ ہے کہ موجودہ قیادت ہوش کے ناخن لے' ماضی کی غلطیوں سے اجتناب کرے' قوم کے حقیقی جذبات اور احساسات کا پاس کرے' اس کے دل کو اپنے ہاتھ میں لے اور خدا پر بھروسہ اور عوام کی قوت کے اعتماد پر بیرونی خطرات اور سازشوں کا مقابلہ کرے۔ سی ٹی بی ٹی ایک جال ہے جس میں داخل ہونا قومی سلامتی کو داؤ پر لگانے کے مترادف ہو گا۔ ملت اسلامیہ پاکستان کسی ایسے اقدام کو ہرگز گوارا نہ کرے گی۔ جو قدم اس راہ میں بڑھے گا اسے روک لے گی۔ یہ محض ایک تکنیکی معاملہ نہیں' یہ ہماری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے' جس سے کھیلنے کی کسی کو اجازت نہیں دی جا سکتی۔

ترجمان القرآن کی اشاعت میں اضافے کے لیے ہم نے اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۹ سہ ماہی مہم آپ کے تعاون سے چلائی۔ اس دوران ہر ماہ ہر قاری کو موقع دیا گیا کہ وہ ہمیں چار پتے ارسال کرے جن پر ہم رسالے کا تعارف ارسال کریں۔ اس طرح کی مہمات میں اگر سب لوگ حصہ لیں' تو بات کہاں سے کہاں پہنچ جائے! جن افراد نے دل چسپی لی' تعاون کیا' ان کی کوششوں سے پرنٹ آرڈر میں ۵ ہزار کا اضافہ ہوا۔ ہم اس پر اللہ کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے۔ ہم اسی کی رضا کے لیے کام کر رہے ہیں۔ جنھوں نے تعاون کیا' کسی دنیاوی لالچ میں نہیں کیا' اخروی منافع کے لیے کیا۔ اللہ ان کی نیت' کوشش اور صدقہ جاریہ کو قبول فرمائے۔

ہم نے بطور خاص بیرون ملک قارئین کو توجہ دلائی تھی کہ وہ پاکستان میں اپنے اعزہ و احباب خصوصاً طلبہ و طالبات کے نام بطور ہدیہ جاری کروائیں۔ ہمارے اندازے کے مطابق اس طرح اشاعت میں ۱۰ ہزار اضافہ ہو سکتا ہے۔ سب ہی نے کچھ نہ کچھ تعاون کیا لیکن کویت کے قارئین نے ایک مقررہ ہدف طے کر کے اسے حاصل کیا۔ ہم نے چاہا تھا کہ سب حلقے اپنا اپنا ہدف طے کر کے ہمیں مطلع کریں۔ اللہ تعالیٰ سب کو توفیق دے۔

مہم کا اپنا ایک انداز ہوتا ہے' لیکن جو تحرک (momentum) پیدا ہوا ہے' اسے جاری رکھنا چاہیے۔ ہماری کوشش اور محنت ہوتی ہے کہ رسالہ مفید اور موثر ہو۔ اس سلسلے میں اپنی آرا اور مشورے بھی دیں' ساتھ ہی اپنے اپنے حلقہ اثر و تعارف میں' اس کا تعارف کروانے کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اس موقع پر ہم سابق مدیر' محترم خرم مرادؒ کا یہ قول دہرانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے کہ اگر سب متعلقہ افراد اپنے حصے کا کام کریں تو ایک لاکھ اشاعت کا ہدف ایک بالکل ممکن الحصول ہدف ہے۔ پھر ہم میں سے کچھ لوگ اپنے حصے کا کام کرنے سے پہلوتہی کیوں کرتے ہیں؟

ہم ہر قاری سے امید رکھتے ہیں کہ اگر وہ ترجمان القرآن کے پیغام کو اپنی اور دوسروں کی دنیا و آخرت کے لیے نافع سمجھتا ہے تو اپنی ذاتی کوشش سے اشاعت میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور کرے گا۔

حکمت مودودیؒ

زندگی کی ضمانت

پچھلی انسانی تاریخ میں جتنی قومیں بھی تباہ ہوئی ہیں ان سب کو جس چیز نے گرایا وہ یہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کیا تو وہ خوش حالی کے نشے میں مست ہو کر زمین میں فساد برپا کرنے لگیں اور ان کا اجتماعی خمیر اس درجہ بگڑ گیا کہ یا تو ان کے اندر ایسے نیک لوگ باقی رہے ہی نہیں جو ان کو برائیوں سے روکتے' یا اگر کچھ لوگ ایسے نکلے بھی تو وہ اتنے کم تھے اور ان کی آواز اتنی کمزور تھی کہ ان کے روکنے سے فساد نہ رک سکا۔ یہی چیز ہے جس کی بدولت آخر کار یہ قومیں اللہ تعالیٰ کے غضب کی مستحق ہوئیں' ورنہ اللہ کو اپنے بندوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے کہ وہ تو بھلے کام کر رہے ہوں اور اللہ ان کو خواہ مخواہ عذاب میں مبتلا کر دے----- اس ارشاد سے یہاں تین باتیں ذہن نشین کرنی مقصود ہیں۔

ایک یہ کہ ہر اجتماعی نظام میں ایسے نیک لوگوں کا موجود رہنا ضروری ہے جو خیر کی دعوت دینے والے اور شر سے روکنے والے ہوں۔ اس لیے کہ خیر ہی وہ چیز ہے جو اصل میں اللہ کو مطلوب ہے' اور لوگوں کے شرور کو اگر اللہ برداشت کرتا بھی ہے تو اس خیر کی خاطر کرتا ہے جو ان کے اندر موجود ہو' اور اسی وقت تک کرتا ہے جب تک ان کے اندر خیر کا کچھ امکان باقی رہے۔ مگر جب کوئی انسانی گروہ اہل خیر سے خالی ہو جائے اور اس میں صرف شریر لوگ ہی باقی رہ جائیں' یا اہل خیر موجود ہوں بھی تو کوئی ان کی سن کر نہ دے اور پوری قوم کی قوم اخلاقی فساد کی راہ پر بڑھتی چلی جائے' تو پھر خدا کا عذاب اس کے سر پر اس طرح منڈلانے لگتا ہے جیسے پورے دنوں کی حاملہ کہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کب اس کا وضع حمل ہو جائے۔

دوسرے یہ کہ جو قوم اپنے درمیان سب کچھ برداشت کرتی ہو مگر صرف انھی چند گنے چنے لوگوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو جو اسے برائیوں سے روکتے اور بھلائیوں کی دعوت دیتے ہوں' تو سمجھ لو کہ اس کے برے دن قریب آ گئے ہیں' کیونکہ اب وہ خود ہی اپنی جان کی دشمن ہو گئی ہے۔ اسے وہ سب چیزیں تو محبوب ہیں جو اس کی ہلاکت کی موجب ہیں اور صرف وہی ایک چیز گوارا نہیں ہے جو اس کی زندگی کی ضامن ہے۔

تیسرے یہ کہ ایک قوم کے مبتلائے عذاب ہونے یا نہ ہونے کا آخری فیصلہ جس چیز پر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں دعوت خیر پر لبیک کہنے والے عناصر کس حد تک موجود ہیں۔ اگر اس کے اندر ایسے افراد اتنی تعداد میں نکل آئیں جو فساد کو مٹانے اور نظام صالح کو قائم کرنے کے لیے کافی ہوں تو اس پر عذاب عام

نہیں بھیجا جاتا بلکہ ان صالح عناصر کو اصلاح حال کا موقع دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر پیہم سعی و جہد کے باوجود اس میں سے اتنے آدمی نہیں نکلتے جو اصلاح کے لیے کافی ہو سکیں' اور وہ قوم اپنی گود سے چند ہیرے پھینک دینے کے بعد اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیتی ہے کہ اب اس کے پاس کوئلے ہی کوئلے باقی رہ گئے ہیں' تو پھر کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی کہ وہ بھٹی سلگا دی جاتی ہے جو ان کوئلوں کو پھونک کر رکھ دے۔

اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا [ہے] کہ ان میں اہل خیر کا موجود نہ رہنا یا بہت کم پایا جانا بھی تو آخر اللہ کی مشیت ہی سے تھا' پھر اس کا الزام ان قوموں پر کیوں رکھا جائے؟ کیوں نہ اللہ نے ان کے اندر بہت سے اہل خیر پیدا کر دیے؟ اس کے جواب میں یہ حقیقت حال صاف صاف بیان کر دی گئی ہے کہ اللہ کی مشیت انسان کے بارے میں یہ ہے ہی نہیں کہ حیوانات اور نباتات اور ایسی ہی دوسری مخلوقات کی طرح اس کو بھی جبلی طور پر ایک لگے بندھے راستے کا پابند بنا دیا جائے جس سے ہٹ کر وہ چل ہی نہ سکے۔ اگر یہ اس کی مشیت ہوتی تو پھر دعوت ایمان' بعثت انبیا اور تنزیل کتب کی ضرورت ہی کیا تھی' سارے انسان مسلم و مومن ہی پیدا ہوتے اور کفر و عصیان کا سرے سے کوئی امکان ہی نہ ہوتا۔ لیکن اللہ نے انسان کے بارے میں جو مشیت فرمائی ہے وہ دراصل یہ ہے کہ اس کو انتخاب و اختیار کی آزادی بخشی جائے' اسے اپنی پسند کے مطابق مختلف راہوں پر چلنے کی قدرت دی جائے' اس کے سامنے جنت اور دوزخ دونوں کی راہیں کھول دی جائیں اور پھر ہر انسان اور ہر انسانی گروہ کو موقع دیا جائے کہ وہ ان میں سے جس راہ کو بھی اپنے لیے پسند کرے اس پر چل سکے تاکہ ہر ایک جو کچھ بھی پائے اپنی سعی و کسب کے نتیجے میں پائے۔

پس جب وہ اسکیم جس کے تحت انسان پیدا کیا گیا ہے' آزادی انتخاب اور اختیاری کفر و ایمان کے اصول پر مبنی ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم خود تو بڑھنا چاہے بدی کی راہ پر اور اللہ زبردستی اس کو خیر کے راستے پر موڑ دے۔ کوئی قوم خود اپنے انتخاب سے تو انسان سازی کے وہ کارخانے بنائے جو ایک سے ایک بڑھ کر بدکار اور ظالم اور فاسق آدمی ڈھال ڈھال کر نکالیں' اور اللہ اپنی براہ راست مداخلت سے اس کو وہ پیدائشی نیک انسان مہیا کر دے جو اس کے بگڑے ہوئے سانچوں کو ٹھیک کر دیں۔ اس قسم کی مداخلت خدا کے دستور میں نہیں ہے۔ نیک ہوں یا بد' دونوں قسم کے آدمی ہر قوم کو خود ہی مہیا کرنے ہوں گے۔ جو قوم بہ حیثیت مجموعی بدی کی راہ کو پسند کرے گی' جس میں سے کوئی معتدبہ گروہ ایسا نہ اٹھے گا جو نیکی کا جھنڈا بلند کرے' اور جس نے اپنے اجتماعی نظام میں اس امر کی گنجایش ہی نہ چھوڑی ہو گی کہ اصلاح کی کوششیں اس کے اندر پھل پھول سکیں' خدا کو کیا پڑی ہے کہ اس کو بزور نیک بنائے۔ وہ تو اس کو اسی انجام کی طرف دھکیل دے گا جو اس نے خود اپنے لیے انتخاب کیا ہے۔ البتہ خدا کی رحمت کی مستحق اگر کوئی قوم ہو سکتی ہے تو صرف وہ جس میں بہت سے افراد ایسے نکلیں جو خود دعوت خیر کو لبیک کہنے والے ہوں اور جس نے اپنے اجتماعی نظام میں یہ صلاحیت باقی رہنے دی ہو کہ اصلاح کی کوشش کرنے والے اس کے اندر کام کر سکیں۔

کفر و اسلام کی اس کش مکش کے دونوں فریق جو کچھ کر رہے ہیں وہ سب اللہ کی نگاہ میں ہے۔ اللہ کی سلطنت کوئی اندھیر نگری چوپٹ راجا کی مصداق نہیں ہے کہ اس میں خواہ کچھ ہی ہوتا رہے، شہ بے خبر کو اس سے کچھ سروکار نہ ہو۔ یہاں حکمت اور بردباری کی بنا پر دیر تو ضرور ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔ جو لوگ اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں وہ یقین رکھیں کہ ان کی محنتیں ضائع نہ ہوں گی۔ اور وہ لوگ بھی جو فساد کرنے اور اسے برپا رکھنے میں لگے ہوئے ہیں، جو اصلاح کی سعی کرنے والوں پر ظلم و ستم توڑ رہے ہیں، اور جنھوں نے اپنا سارا زور اس کوشش میں لگا رکھا ہے کہ اصلاح کا یہ کام کسی طرح چل نہ سکے، انھیں بھی خبردار رہنا چاہیے کہ ان کے یہ سارے کرتوت اللہ کے علم میں ہیں اور ان کی پاداش انھیں ضرور بھگتنی پڑے گی (تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۳۷۴-۳۷۵)۔

حاصل رمضان' حاصل شب قدر

انفرادی اصلاح اور اجتماعی اصلاح کا
ملک کو کرپشن' ظلم اور فسق و فجور سے پاک کرنے کا
معاملات کی درستی اور عائلی زندگی تک کو سکون سے آشنا کرنے کا
ایک ہی نسخہ--- ایک ہی علاج ہے۔
(باقی سب ٹامک ٹوئیاں ہیں)

قرآن کے انداز سے' قرآن کے ہی بتائے ہوئے طریقے اختیار کر کے
اللّٰہ پر ایمان' آخرت پر ایمان' اور رسولؐ پر ایمان کو زندگی میں جاری وساری کر دیا جائے۔

علما' ائمہ' اساتذہ' گھر کے بڑے' ذرائع ابلاغ ---سب اس کو اولین اہمیت دیں۔
پھر دنیاوی خوش حالی' منزل حیات نہ ہوگی
آخرت کی کامیابی' نصب العین ہوگی
---اور دنیا کی کامیابی رستے میں پڑی ہوئی ملے گی!
یہی ہر حکومت کا ایجنڈا' ہر سیاسی پارٹی کا منشور ہونا چاہیے!!

ہم نے رمضان میں بہت قرآن پڑھے' بہت قرآن سنے
ہم پر یہ حقیقت کیوں آشکار نہیں ہوتی کہ
ہم من حیث القوم ایمان سے محروم ہیں'
دنیاوی خسران سے دوچار ہیں اور اخروی خسران کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں!
قرآن کے آئینے میں اپنی تصویر--- ہمیں کیوں نظر نہیں آتی؟

اگر ہم خدا سے ڈریں' مرنے کے بعد اٹھنے اور جواب دینے پر یقین رکھیں
اور اسوہ رسولؐ پر عمل کریں---تو
ملک کا کون سا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا!!

(خیر خواہ)

قرآن کا اجتماعی مطالعہ

بنیادی اصول اور تقاضے

خرم مرادؒ

فہم قرآن کی جستجو میں ضروری ہے کہ آپ حق کے متلاشی دوسرے افراد کے ہمراہ شریک سفر بن جائیں۔ یہ تو ضروری ہے کہ آپ انفرادی طریقے پر قرآن مجید کا مطالعہ کرتے رہیں' لیکن جب آپ قرآن کے مفہوم اور مطالب کی تلاش اور جستجو کرنے والے دوسرے اہل ایمان کے ساتھ مل کر اجتماعی مطالعہ کرتے ہیں' تو آپ کے استفادے کے ثمرات دگنا ہو جاتے ہیں۔ اجتماعی مطالعے میں دل و دماغ کی قوت اخذ بڑھ جاتی ہے اور وہ زیادہ صحیح طریقے سے مفہوم اور مطالب کو اپنی گرفت میں لے آتے ہیں۔ جس طرح باہمی رفاقت میں آپ قرآن کے زیر سایہ زندگی بسر کرتے ہیں اسی طرح باہمی رفاقت میں قرآن کے تقاضے پورے کرنے کا مرحلہ بھی آسانی سے طے ہو جاتا ہے۔ اس طرح عمل پیرا ہونے اور تقاضے پورے کرنے سے آپ قرآن کی برکتوں سے پوری طرح مستفید ہو سکتے ہیں اور فہم قرآن کے دروازے بھی زیادہ کھل جاتے ہیں۔

قرآن کا تخاطب خصوصیت کے ساتھ جماعت سے ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول وحی کے ساتھ ہی ایک ایسی جماعت قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی جس کا مرکز اور محور قرآن ہو۔ ساری زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ آپؐ نے اس مقصد کے لیے صرف کر دیا۔ اقراء کے حکم کے ساتھ ہی قُمْ فَاَنْذِرْ (اٹھو اور ڈراؤ) کا حکم بھی نازل ہوا۔ اسی طرح جہاں یہ حکم نازل ہوا: اے نبیؐ' تمھارے رب کی کتاب میں سے جو کچھ تم پر وحی کیا گیا ہے' اس کی تلاوت کرو (پڑھو اور پھیلاؤ) (الکہف ۱۸:۲۷)' تو اس کے متصل ہی دوسری آیت میں یہ حکم نازل ہوا: اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں' اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ (الکہف ۱۸:۲۸)۔

قرآن کی یہ آیات واضح اور مؤثر انداز میں قرآن کی تلاوت اور ایک متحد و مربوط گروہ (معاشرہ) قائم

کرنے کے درمیان ربط قائم کر رہی ہیں۔

کوئی نماز بغیر قرآن پڑھے مکمل نہیں ہوتی، اور کوئی نماز بلاعذر شرعی بغیر جماعت کے ادا نہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ نماز میں قرآن مجید کے پڑھنے کا کیا فائدہ، جب اس کو نہ سنا جائے، نہ سمجھا جائے اور نہ ہی اس پر غور کیا جائے؟ ظاہر ہے کہ باجماعت نماز میں تلاوت قرآن اجتماعی فہم قرآن کا موقع ہے، اور اس طرح قرآن فہمی کا مقصد دن میں پانچ مرتبہ اجتماعی طریقے سے حاصل کیا جاتا ہے۔

قرآن کی دعوت کو سارے انسانوں تک پہنچانے کا تقاضا بھی یہی مطالبہ کرتا ہے کہ قرآن کو اجتماعی طور پر پڑھا جائے اور سمجھا جائے۔ لفظ "تلاوت" جب حرف "علیٰ" کے ساتھ بولا جاتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے: سنانا، پہنچانا، نشر کرنا، اشاعت کرنا۔ قرآن مجید کی تلاوت کرنا نبوت کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے اور اسی لیے امت مسلمہ کے مقاصد میں بھی شامل ہے۔

اسی طرح قرآن مجید بالواسطہ یہ ہدایت دیتا ہے کہ اس کو گھروں اور خاندانوں میں پڑھا جائے (نبیؐ کی بیویو! یاد رکھو: اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو جو تمھارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں۔ احزاب ۳۳:۳۴)۔

جو لوگ اس لیے جمع ہوتے ہیں کہ قرآن کی تلاوت کریں اور اس کا مطالعہ کریں، وہ مبارک ہیں۔ ان پر اللہ کے فرشتے اللہ کی رحمت کے ساتھ نازل ہوتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

> جب کبھی لوگ اللہ کے گھروں میں جمع ہوتے ہیں، قرآن مجید کی تلاوت کرنے اور اس کو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر پڑھنے اور پڑھانے کے لیے، ان پر برکت نازل ہوتی ہے، رحمت ان کو گھیرے میں لے لیتی ہے، فرشتے ان پر سایہ کرتے ہیں اور اللہ اپنی محفل میں ان کا ذکر کرتا ہے (مسلم)۔

اس لیے قرآن کو تنہا پڑھ کر مطمئن نہ ہونا چاہیے بلکہ دوسرے متلاشیان حق کو جمع کر کے اجتماعی طور پر یہ کام انجام دینا چاہیے۔

اجتماعی مطالعے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں:

۱۔ جب ایک مختصر سا گروہ ایک جگہ جمع ہو کر اس طرح قرآن کا مطالعہ کرتا ہے کہ ہر شریک اس مطالعے میں سرگرمی سے حصہ لے، خواہ عالم ہو یا نہ ہو۔ ایک فرد بہرحال زیادہ علم والا ہونا مفید ہے جو ان کی رہنمائی کرے۔ اس کو ہم حلقہ کہیں گے۔

۲۔ جب ایک چھوٹا یا بڑا گروہ ایک جگہ جمع ہوتا ہے اور کسی عالم کا درس سنتا ہے (اس میں سامعین صرف سوالات کر سکتے ہیں) اس کو ہم درس کہیں گے۔

تاہم یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ حلقہ کس طرح چلایا جاتا ہے، اور درس کی تیاری کس طرح کی جاتی

ہے۔ یہاں ہم صرف عملی ہدایات پر گفتگو کریں گے۔ یہ بھی واضح رہے کہ اس کام کے لیے نہ کوئی معین معیار ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی معین طریقہ کار۔ مختلف افراد اپنا خاص انداز اور خاص طریقہ کار اختیار کر سکتے ہیں۔ درج ذیل ہدایات دراصل اشارات ہیں جن کو مخصوص حالات اور اپنی استعداد کے مطابق اختیار کیا جا سکتا ہے۔

چار بنیادی ضابطے

اجتماعی مطالعے کے لیے چار بنیادی ضابطے ضروری ہیں:

۱۔ حلقہ میں شرکت یا درس کی ذمہ داری کا حق ادا کرنے کے لیے پوری طرح تیاری کرنا چاہیے۔ سرسری نظر ڈال لینے سے تیاری نہیں ہوتی۔ تیاری کرنے کو آخری لمحے تک موخر کرتے چلے جانا بھی درست نہیں۔ یہ غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے کہ ایک نظر ڈالنے سے سب کچھ یاد آجائے گا۔ قرآن کے متعلق کوئی بات بغیر غور و فکر کے زبان سے نہیں نکالنا چاہیے۔ زیادہ مناسب طریقہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں آپ نے جو مطالعہ کیا ہے اور آپ جو کہنا چاہتے ہیں' اس کو نوٹ کر لیں۔

۲۔ آپ خواہ مبتدی ہوں یا صاحب علم' آپ درس دے رہے ہوں یا حلقہ میں شرکت کر رہے ہوں' بہرکیف آپ اپنے طور پر ان حصوں کا مطالعہ ضرور کریں جو حلقہ یا درس کا موضوع ہوں۔

۳۔ ہمیشہ اپنی نیت خالص رکھیے۔ یعنی یہ کہ مقصد قرآن کو سمجھنا ہے اور اس کے مطابق عمل کرنا ہے' اور یہ سب اس لیے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے۔

۴۔ اجتماعی مطالعہ تفریح کے لیے' یا علمی نکات بیان کرنے کے لیے' یا بحث و تکرار کے لیے نہیں ہونا چاہیے۔ مطالعہ قرآن کا نتیجہ اتباع قرآن کی شکل میں ظاہر ہونا چاہیے اور اس دعوت کو پھیلانے کی لگن بھی پیدا ہونا چاہیے جو قرآن اپنے قاری کے سپرد کرتا ہے۔

درس کی تیاری

اجتماعی درس کے لیے مندرجہ ذیل ہدایات معاون ثابت ہوں گی:

۱۔ سب سے پہلے سامعین کی نوعیت اور استعداد کے متعلق صحیح اندازہ لگانا چاہیے۔ ان کا علم' ان کی فہم و فراست' ان کا درجہ ایمان' ان کے تفکرات اور پریشانیاں اور ان کی خواہشات و ضروریات کیا ہیں؟

۲۔ پھر سامعین کو سامنے رکھ کر موزوں آیات کا انتخاب کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کے پاس چند آیات کی تیاری موجود ہے' بس اس کو پیش کر دیا' خواہ اس کا تعلق سامعین کے حالات اور تقاضوں سے ہو یا نہ ہو۔

۳۔ اسی طرح زبان' طرز بیان' اظہار بیان میں بھی سامعین کا لحاظ ضرور رکھنا چاہیے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کیجیے کہ وہ آپ کو توفیق بخشے کہ آپ قرآن کا صحیح مفہوم پا سکیں اور اسے سامعین کے سامنے بیان کر سکیں۔

۵۔ پہلے آیات کا مطالعہ کیجیے اور نوٹس تیار کیجیے۔ یہ سوچیے کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں، پورا مضمون کس ترتیب سے پیش کرنا چاہتے ہیں، آغاز کس طرح کریں گے اور اختتام کیسے ہو گا؟

۶۔ وقت کا پورا لحاظ رکھیے۔ معین وقت سے زیادہ ہرگز آگے نہ بڑھیے، خواہ آپ کے ذہن میں کتنے ہی قابل قدر نکات موجود ہوں اور آپ کو ان کو پیش کرنے کا شوق بھی ہو۔ آپ کے ذہن میں یہ بات رہنا چاہیے کہ سامعین کے یاد رکھنے کی صلاحیت محدود ہوتی ہے۔ وہ آپ کے علم و فضل کے مداح تو بن جائیں گے مگر آپ سے زیادہ سیکھیں گے نہیں۔

طویل حصے کو مختصر سے وقت میں بھی بیان کیا جا سکتا ہے اور مختصر سے حصہ کو طویل وقت میں بھی۔ یہ سب اس بات پر منحصر ہے کہ آپ زیر درس آیات سے درحقیقت سامعین کو سنانا کیا چاہتے ہیں۔

۷۔ آخر میں درس کا پیغام واضح الفاظ میں سامعین کے سامنے پیش کر دیجیے تاکہ وہ ان کے ذہنوں میں محفوظ رہے، اور وہ اس پر غور کرتے رہیں۔ اس پیغام کا تعلق آیات زیر درس کے مرکزی مضمون سے ہونا چاہیے۔

درس دینے کا طریقہ

۱۔ درس دیتے ہوئے صرف دو مقاصد پیش نظر ہونے چاہییں:

(الف) اللہ کا کلام، اللہ کے بندوں کو سنانے سے صرف اللہ کی رضا مقصود ہو۔

(ب) قرآن کا پیغام واضح انداز میں اور مؤثر زبان میں پیش ہونا چاہیے۔

۲۔ یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہے کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے کہ وہ قرآن کا پیغام آپ کی زبان سے سامعین کے دل و دماغ میں اتار دے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ محتاجی کی اس نسبت سے آپ کی اپنی یہ ذمہ داری کم نہیں ہو جاتی کہ آپ کماحقہ تیاری کریں، اور بہترین طریقے سے درس دینے کی کوشش کریں۔ قرآن کے پیغام کو زندہ اور متحرک پیغام کے طور پر پیش کریں اور پیغام کا تعلق وقت کے حالات سے اور مسائل سے جوڑتے چلے جائیں تاکہ اس کی اہمیت واضح ہو۔

طرز ادا کی تاثیر کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ آپ کا بیان فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ معیار کا حامل ہو۔ سیدھے سادے انداز میں بیان کیجیے تو زیادہ مؤثر ہو گا۔ اصل اہمیت آپ کی نیت اور آپ کی تیاری کی ہے۔

۳۔ پہلے سامعین کے سامنے ساری آیات کی تلاوت کریں، پھر ترجمہ سنائیں، پھر تشریح و تفسیر بیان کریں۔ آیات کو دوبارہ پڑھ کر تشریح کریں یا نہ کریں، یا پہلے ایک مختصر تمہید بیان کر دیں، پھر ایک ایک

آیت کی تشریح کرتے جائیں--- جتنا وقت آپ کے پاس ہو' اسی کے پیش نظر آپ اپنے لیے کوئی طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔ اگر وقت مختصر ہو تو تمام آیات کا آغاز میں تلاوت کرنا بھی ضروری نہیں۔ یہ وقت سامعین کی توجہ مبذول کرانے اور ان کو تیار کرنے میں صرف کریں کہ کیا چیز ان کے سامنے پیش کی جانے والی ہے۔

۴۔ ایک ایک آیت لیں' یا چند آیات اکٹھی' جیسے چاہیں ترجمہ اور تشریح بیان کریں۔ اصل چیز یہ ہے کہ آپ کے بیان سے سامعین پر یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ یہ مربوط بیان ہے اور ایک آیت سے دوسری آیت کا مضمون پیدا ہو رہا ہے۔

۵۔ اختتام پر خلاصہ اور نتیجہ ضرور پیش کرنا چاہیے۔ اگر وقت باقی ہو تو تمام آیات کو دوبارہ پڑھ کر ان کا ترجمہ سنانا بھی مفید ہو سکتا ہے۔ اس طرح قرآن کی آیات کے ترجمے سے درس کا ربط سامعین کے ذہن میں مستحضر ہو جائے گا۔

۶۔ آپ اپنا بیان نہ پیش کریں' قرآن کی آیات خود بولیں۔ تفسیر کے بغیر بھی قرآن بڑی تاثیر رکھتا ہے' خاص طور پر اہل زبان کے لیے۔ بیچ بیچ میں ضرورت سے زیادہ اپنی آرا کو داخل کرنا دراصل قرآن کو بولنے سے روک دینے کے مترادف ہے۔ لمبی لمبی تشریحوں کا نقصان یہ ہے کہ سامع کا ذہن تشریح میں گم ہو جاتا ہے' اور آیات کے مطلب پر اس کی توجہ نہیں رہتی۔ اس لیے تشریح مختصر ہو۔ جہاں ضروری ہو جائے وہاں اگر بیان طویل ہو' تب بھی بار بار آیت دہرا کر اس سے ربط قائم رکھنا ضروری ہے۔ کوشش یہ کیجیے کہ قرآن اور سامعین کے اذہان کے درمیان فاصلہ نہ پیدا ہو۔

۷۔ قرآن کے نمونے اور انداز پر اپنا درس پیش کرنے کی کوشش کیجیے۔ کامیابی کا یہ سب سے بہتر طریقہ ہے۔ آغاز میں کچھ دشواری محسوس ہو گی مگر بتدریج راہ آسان ہو جائے گی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کو بار بار پڑھا جائے' اس کے حصے ازبر کیے جائیں اور اس کے اسلوب بیان کو جذب کیا جائے۔

قرآنی اسلوب کے درج ذیل حقائق آپ کو معلوم ہونے چاہییں:

(الف) یہ دل و دماغ' عقل اور جذبات یعنی کل انسان کو خطاب کرتا ہے۔

(ب) اس کا تخاطب شخصی ہے' بالراست ہے' مختصر ہے اور اس میں فکری انگیخت پائی جاتی ہے۔

(ج) اس کی زبان اور بیان بھی اتنا ہی زوردار ہے جتنا اس کا پیغام زوردار ہے۔ یہ سیدھا دل پر اثرانداز ہوتا ہے۔

(د) یہ ایسے دلائل دیتا ہے جو سامعین آسانی سے سمجھ سکیں۔ یہ دلائل روز مرہ کی زندگی اور مشاہدہ سے فراہم کیے جاتے ہیں۔ یہ زود فہم ہوتے ہیں۔ یہ تخیلی' تجریدی یا منطقی نہیں ہوتے۔

۸۔ تجریدی انداز نہ اختیار کیجیے' نہ فلسفہ بنا کر پیش کیجیے بلکہ قرآن کی دعوت کو زندہ و متحرک بنا کر پیش کیجیے۔ قرآن کا پیغام پہنچانے میں نظم اور کسی قدر تصورات کا استعمال بھی ضروری ہے۔ اس کے لیے عام فہم زبان استعمال کیجیے تاکہ ہر شخص سمجھ سکے۔

۹۔ عمل کی دعوت دینا' تجدید عہد کرانا' عزم نو پیدا کرنا' آپ کے درس کا لازمی حصہ ہونا چاہیے۔ تاریخ کا ذکر ہو یا مظاہر فطرت کا تذکرہ' کوئی امر و نہی ہو یا کوئی بیان اور مکالمہ ہو' ہر حال میں درس پیش قدمی کرنے' اطاعت کرنے اور عمل کرنے پر ابھارنے میں معاونت کرے۔

۱۰۔ قرآن سے اپنے نظریات نہ نکالیں' بلکہ اپنے نظریات قرآن کے تابع بنائیں۔

۱۱۔ بیان ایسا ہو کہ قرآن سامعین کے دل میں اتر جائے۔ قرآن کی قدر و قیمت اور محبت دلوں میں پیدا ہو جائے۔ احسان مندی اور شکرگزاری کے جذبات دل میں موجزن ہوں۔ درس میں ان مقاصد کا حصول پیش نظر رہنا چاہیے۔

۱۲۔ سامعین کے ردعمل پر بھی توجہ دیتے رہنا چاہیے۔ ان کے ردعمل کی روشنی میں اپنی گفتگو کو مختصر یا ختم' یا کوئی نئی بات جس کی ضرورت ہو' جیسا حالات کا تقاضا ہو' وہ کرنا چاہیے۔

صاحب درس کو اپنا منفرد طریقہ کار' طرز بیان اور اسلوب بیان پیدا کرنا چاہیے۔

هدانا الله وایاکم لهذا القرآن الحکیم ونحن علی ذلكَ من الشّٰهدین

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اور آپ کو اس قرآن سے ہدایت دی ہے اور ہم اس پر گواہی دینے والوں میں سے ہیں (انگریزی کتاب Way To the Qur'an کے ایک باب کا ترجمہ)۔

(ری پرنٹ دستیاب ہیں' منشورات' منصورہ' لاہور)

اصلاحِ نفس اور اسمائے حسنیٰ

پروفیسر ڈاکٹر احسان الحق ٥

جس طرح یہ کائنات اللہ کے رازوں میں ایک بہت بڑا راز ہے' اسی طرح انسان بھی تخلیق کے عجائبات میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح روز بروز کائنات کی وسعتیں اور بے کرانیاں انسان پر کھلتی جا رہی ہیں اور وہ حیرتوں کے ایک اتھاہ سمندر میں اترتا چلا جا رہا ہے' اسی طرح خود اس کے وجود کے بارے میں بھی نت نئی معلومات' نفسیات و مابعد النفسیات' شعور و لاشعور کے مسائل' ماحول اور موروثی رویوں کے بارے میں نت نئی تحقیقات اسے اپنے وجود کا ایک نیا شعور عطا کر رہی ہیں۔ علم البشریات کی ہر شاخ ایک مستقل علم کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

انسان کے اخلاقی وجود کے بارے میں قرآن مجید سے بہت واضح رہنمائی ملتی ہے۔ اس کی روشنی میں انسانی وجود کے تین پہلو قابل غور ہیں: ۱۔ روح' ۲۔ نفس' ۳۔ جسم۔

"روح" انسانی وجود کا علوی (بالائی) پہلو ہے۔ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ (الحجر ۲۹:۱۵) اور میں نے اس میں اپنی روح پھونکی--- "روح" انسان کا رشتہ خدا سے قائم کرتی ہے۔ اسی لیے اسے امر ربی کہا گیا۔ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (بنی اسرائیل ۸۵:۱۷) کہہ دیجیے کہ روح میرے رب کا امر ہے--- "روح" انسان کو بلندیوں کی طرف کھینچتی ہے بلکہ وجود انسانی میں روح خداوندی ہی انسانیت کا حقیقی شرف ہے۔ جسم مٹی سے بنا ہے۔ لہٰذا جسم کا رجحان زمین کی طرف ہے۔ وجود انسانی میں جسمانی تقاضے وجود کا سفلی (پست) پہلو ہیں۔ زن' زر اور زمین کی محبت اسی وجود کے کرشمے ہیں۔ نفس ان دونوں کے درمیان ہے۔ نفس کا ایک حصہ روح کے تقاضوں پر مبنی ہے' بلندیوں کی طرف مائل ہے' جب کہ دوسرا حصہ حیوانی تقاضوں پر مبنی ہے اور پستیوں کی طرف مائل ہے۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (الشمس ۸:۹۱) کا یہی مفہوم ہے کہ اللہ نے نفس انسانی میں فجور (برائی) اور تقویٰ دونوں رکھ دیے ہیں۔

---

٥ پروفیسر' شعبہ عربی' جامعہ کراچی

گویا نفس میں روح اور جسم دونوں کے تقاضے جمع کر دیے گئے ہیں۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اپنے عمل کے ذریعے نفس کے کون سے تقاضوں کو جلا دیتا ہے۔ اگر وہ حیوانی وجود کے زمینی تقاضوں کو پورا کرنا اپنا مقصد حیات بنا لیتا ہے، تو وہ اپنی روح کو گھائل کر لیتا ہے۔ مادی اور شہوانی تقاضوں کا غلبہ بالآخر اسے حیوانات بلکہ ان سے بھی بدتر درجے پر گرا دیتا ہے۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ (التین ۹۵: ۵) پھر ہم نے اسے پست ہونے والوں کے پست ترین درجے کی طرف لوٹا دیا۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (الاعراف ۷: ۱۷۹) یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں--- نفس کے حیوانی تقاضوں پر قابو نہ پانا ہی انسان کی ناکامی ہے۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس ۹۱: ۱۰) اور یقیناً وہ ناکام ہوا جس نے اسے خاک میں ملایا--- زمین اور متعلقات زمین میں انسان کی حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی اس کے لیے آسمانوں کے دروازے بند کر دیتی ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ط (الاعراف ۷: ۴۰) یقین جانو، جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے اور ان کے مقابلے میں سرکشی کی ہے، ان کے لیے آسمان کے دروازے ہرگز نہ کھولے جائیں گے۔ ان کا جنت میں جانا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گزرنا۔

نفس کے شرور سے کیسے آگاہی حاصل کی جائے، یہ کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لیے ایسے ہی طبی معائنے کی ضرورت ہے، جیسے جسم کے لیے طبی معائنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر جسمانی طبی معائنے سے غفلت برتی جائے تو متعدد جسمانی امراض اندر ہی اندر پرورش پاتے رہتے ہیں۔ پھر اچانک طبی معائنے پر معلوم ہوتا ہے کہ جسم کا بڑا حصہ کینسر کا شکار ہو چکا ہے، یا دل کی بیشتر نالیاں بند ہو چکی ہیں، اور انسان موت کے دہانے پر کھڑا ہے۔ یہی صورت حال نفس کی بیماریوں کی بھی ہے کہ اگر خود احتسابی (مراقبہ) کے ذریعے گاہے گاہے نفس کا طبی معائنہ نہ کیا جائے تو نفس کے اندر متعدد بیماریاں جڑ پکڑ لیتی ہیں۔ دنیا کی محبت، نفرت، بغض اور تعصب کی بیماریاں، نفس انسانی کو بیمار کر دیتی ہیں اور اس کے علوی روحانی پہلو کو گہنا دیتی ہیں۔ اس کے اندر خیر اور بھلائی کو دبا دیتی ہیں۔ خود احتسابی کے ذریعے نفس کے امراض پر مطلع ہونا کافی نہیں ہے، شفا اسی وقت ہو گی جب مؤثر علاج کی ضروری تدابیر اختیار کی جائیں گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہم جسمانی بیماریوں کے انکشاف پر ان کے علاج کا اہتمام کرتے ہیں۔

نفس کی بیماریوں کا علاج کیسے کیا جائے؟ اس کے متعدد طریقے ہو سکتے ہیں۔ علما و صوفیا نے اپنے اپنے ذوق اور روحانی تجربے کے تحت مختلف قسم کے مریضوں کے لیے مختلف علاج تجویز کیے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سکھائی ہوئی دعائیں بھی ہماری راہنما ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

اَللّٰهُمَّ لَا تَكِلْنَا اِلٰى اَنْفُسِنَا فَنَعْجِزْ وَلَا اِلَى النَّاسِ فَنَضِيْعَ، اے اللہ، تو ہمیں ہمارے نفسوں کے سپرد نہ کیجیو کہ ہم ڈھیر ہو جائیں، اور نہ تو ہمیں لوگوں کے سپرد کر کہ ہم برباد ہو جائیں۔

اَللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ اَرْجُوْ فَلاَ تَكِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَةَ عَیْنٍ وَاَصْلِحْ لِیْ شَاْنِیْ' اے اللہ' میں تیری رحمت کا سوالی ہوں۔ پس تو مجھے ایک پلک جھپکنے کے برابر بھی میرے نفس کے سپرد نہ کر' اور میرے احوال کی اصلاح فرما دے۔

ان دعاؤں کے ساتھ ساتھ تزکیہ کا ایک بہترین ذریعہ اسماے حسنیٰ کا ذکر ہے جو قرآن حکیم کی آیات کے تمات (خواتیم) میں مذکور ہیں۔ یہ اسماے حسنیٰ جہاں بہت سے امراض کا علاج ہیں' وہیں بہت سے استفسارات (سوالات) کا جواب بھی ہیں۔ قرآن حکیم اہل ایمان کے لیے کتاب ہدایت ہونے کے ساتھ ساتھ کتاب شفا بھی ہے:

قُلْ هُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هُدًی وَّشِفَآءٌ (حم السجدہ ۴۱: ۴۴) کہہ دیجیے یہ قرآن اہل ایمان کے لیے ہدایت اور شفا ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (بنی اسرائیل ۱۷: ۸۲) اور ہم اس قرآن میں وہ کچھ نازل کرتے ہیں جو اہل ایمان کے لیے شفا اور رحمت ہے۔

قرآن حکیم کا یہ دعویٰ شفا صرف نفس کی بیماریوں کے لیے ہی نہیں بلکہ جسمانی بیماریوں کے لیے بھی ہے۔ اس لیے کہ نفس کے مادی و روحانی تقاضوں کا اختلال (عدم توازن) براہ راست جسم کو بھی متاثر کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

اور اے نبیؐ' ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا۔ آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا۔ یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعے سے بلندی عطا کرتے' مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا' لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے (الاعراف ۷: ۱۷۵-۱۷۶)۔

اس آیت میں دنیا کی حد سے بڑھی ہوئی محبت کی بیماری کی طرف اشارہ ہے جو ایک انسان کو شرف انسانیت سے محروم کر کے اس میں کتے جیسے خصائل پیدا کر دیتی ہے۔ حد سے بڑھا ہوا یہ لالچ اسے نفسیاتی و جسمانی بیماریوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ذہنی دباؤ' اعصابی ٹوٹ پھوٹ' بلند فشار خون کے متعدد اسباب میں سے ایک بڑا سبب حب دنیا ہے۔

مشکل یہ ہے کہ ایک مومن خود احتسابی کے نتیجے میں نفس کی بیماریوں پر مطلع ہونے کے باوجود ان پر قابو پانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اعلیٰ اخلاقی بلندیوں کی راہ میں اس کی داخلی (نفسیاتی) و خارجی (معاشرتی) گرہیں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ کون نہیں چاہتا کہ اس سے بخل کی بیماری جاتی رہے۔ کون نہیں چاہتا کہ وہ

اپنی حاجتوں کی طلب میں صرف اللہ کا محتاج ہو اور خلق سے بے نیاز ہو جائے۔ کون نہیں چاہتا کہ اس کا دل بغض و حسد کے جراثیم سے پاک ہو جائے۔ کون نہیں چاہتا کہ اس کی زبان سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے اور وہ اپنی گفتار و کردار میں اللہ کی برہان بن جائے۔ ان سب چاہتوں کے باوجود وہ ان اوصاف کو سماجی و نفسیاتی اور موروثی (جینیاتی) اسباب کے تحت اپنے اندر عملاً پیدا نہیں کر پاتا۔

خواہش اور نیت کی اپنی اہمیت ہے لیکن یہ جب ہی مؤثر ہو گی جب عملی اقدامات کیے جائیں۔ عمل اور کوشش میں ذکر الٰہی سے مدد ملتی ہے۔ اس کا ایک طریقہ اسماے حسنیٰ کا ذکر ہے۔ ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ص وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْۤ اَسْمَآئِهٖ ط (الاعراف ۷: ۱۸۰) اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے، اس کو اچھے ہی ناموں سے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے نام رکھنے میں راستی سے منحرف ہو جاتے ہیں۔

قرآن حکیم کی آیات کے تمات جن اسماے حسنیٰ پر ختم ہوئے ہیں وہ محض حسن کلام نہیں ہیں بلکہ ہر اسم مبارک اس کیفیت کا علاج اور اس مرض کی شفا ہے جس کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے۔

چنانچہ اندیشہ فقر اور بخل کا علاج یاوَاسِعُ یاعَلِیْمُ کا ذکر ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے:

شیطان تمھیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرز عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے، مگر اللہ تمھیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے' (وَاسِعٌ عَلِيْمٌ) (۲: ۲۶۸)۔

مایوسی، ناامیدی اور بے یقینی کا علاج یاوَلِیُّ ہے۔ سورہ شوریٰ میں ارشاد ربانی ہے:

وہی ہے جو لوگوں کے مایوس ہو جانے کے بعد مینہ برساتا ہے' اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے اور وہی قابل تعریف ولی ہے' (وَلِيُّ) (۴۲: ۲۸)۔

اچھی گفتگو اور اچھی عادتیں پیدا کرنے کے لیے سورہ حج کی آیت ۲۴ کی روشنی میں یاحَمِیْدُ کا ذکر نہایت مؤثر ہو گا' باذن اللہ۔

اور (یہ اہل جنت) پاکیزہ قول کی طرف ہدایت دیے گئے اور محمود راستہ کی طرف ان کی رہنمائی کی گئی' (الْحَمِيْدِ) (۲۲: ۲۴)۔

اعزہ و اقربا اور دوستوں کے درمیان فساد کے خاتمے (نزغ شیطانی ختم کرنے) کے لیے اور تعلقات کی بحالی کے لیے سورہ یوسف کی آیت ۱۰۰ اور سورہ حج کی آیت ۵۲ کی روشنی میں یاعَلِیْمُ یاحَکِیْمُ کا ذکر نہایت مؤثر ہو گا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دونوں آیات کا خاتمہ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ کے اسماے حسنیٰ پر ہوا ہے۔

شیطان کے وسوسوں اور اس کی چالوں کے مقابلے کے لیے سورہ بنی اسرائیل کی ان آیات کی

روشنی میں یَاوَکِیْلُ کا ذکر نہایت مؤثر ہو گا:

اور یاد کرو جب کہ ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو' تو سب نے سجدہ کیا' مگر ابلیس نے نہ کیا۔ اس نے کہا "کیا میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے؟" پھر وہ بولا "دیکھ تو سہی' کیا یہ اس قابل تھا کہ تو نے اسے مجھ پر فضیلت دی؟ اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں اس کی پوری نسل کی بیخ کنی کر ڈالوں' بس تھوڑے ہی لوگ مجھ سے بچ سکیں گے"۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اچھا تو جا' ان میں سے جو بھی تیری پیروی کریں' تجھ سمیت ان سب کے لیے جہنم ہی بھرپور جزا ہے۔ تو جس جس کو اپنی دعوت سے پھسلا سکتا ہے' پھسلا لے' ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا' مال اور اولاد میں ان کے ساتھ ساجھا لگا' اور ان کو وعدوں کے جال میں پھانس--- اور شیطان کے وعدے ایک دھوکے کے سوا اور کچھ بھی نہیں--- یقیناً میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہو گا' اور توکل کے لیے تیرا رب کافی ہے" (وَكِيلًا) (۱۷: ۶۱-۶۵)۔

شدید قسم کے اضطراب و بے چینی اور احساس تنہائی کے لیے یَاتَوَّابُ یارحیمُ کا ذکر سورہ توبہ کی آیت ۱۱۸ کی روشنی میں نہایت مفید ہو گا' باذن اللّٰہ۔ اس آیت میں حضرت کعبؓ بن مالک اور ان کے ساتھیوں کی توبہ کی قبولیت کا ذکر ان کی نفسیاتی کیفیت کی تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ آیت کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

اور ان تینوں کو بھی اس نے معاف کیا جن کے معاملے کو ملتوی کر دیا گیا تھا۔ جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انھوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے کوئی جاے پناہ خود اللہ ہی کے دامن رحمت کے سوا نہیں ہے' تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں۔ یقیناً وہ تواب اور رحیم ہے (۹: ۱۱۸)۔

خلق سے بے نیازی اور توقعات وابستہ نہ کرنے کے لیے سورہ فاطر اور سورہ محمد کی آیات کی روشنی میں یَاغَنِیُّ کا ذکر مؤثر ہو گا' باذن اللّٰہ۔

سورہ فاطر کی آیت کا ترجمہ ہے:

اے لوگو' تم سب اللہ کے محتاج ہو اور اللہ تو غنی و حمید ہے (۳۵: ۱۵)۔

سورہ محمد میں ارشاد ہوا:

دیکھو' تم لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو۔ اس پر تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو بخل کر رہے ہیں' حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کر رہا ہے۔ اللہ تو غنی ہے' تم ہی اس کے محتاج ہو۔ اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمھاری جگہ کسی اور قوم کو

لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے (۴۷: ۳۸)۔

گویا بخل کا علاج اور خلق کی محتاجی دونوں کا علاج یَاغَنِیُّ کا اسم مبارک ہے۔

بیشتر امور غیبیہ کی آیات کا خاتمہ اسم مبارک قدیر پر ہوا ہے۔ سورہ شوریٰ کی آیات ۴۹-۵۰ کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

اللہ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں ملا جلا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قادر ہے، (عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ) (۴۲: ۴۹، ۵۰)۔

اس حوالے سے سورہ الفرقان کی آیت ۵۴ ملاحظہ ہو:

اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر پیدا کیا، پھر اس سے نسب اور سسرال کے دو الگ سلسلے چلائے۔ تیرا رب بڑا ہی قدرت والا ہے، (قَدِیْرًا) (۲۵: ۵۴)۔

لہٰذا ان امور غیبیہ یا ان کے علاوہ دیگر معاملات میں رہنمائی کے لیے یاقدیر کے ذکر یا یاعلیم یا قدیر کے ذکر کے بعد دعا مستجاب ہو گی، باذن اللہ۔

یاد رہے کہ اسماے حسنٰی کے یہ فوائد انھی خاص مقاصد تک محدود نہیں ہیں جن کے لیے درج کیے گئے ہیں بلکہ ان مرکزی مقاصد کے ساتھ ساتھ یہ کئی ذیلی روحانی اور جسمانی منفعتیں بھی رکھتے ہیں جن کا دیگر آیات کی روشنی میں تعین کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات بھی بیان کرنے کی نہیں ہے کہ مخصوص ذکر کی یہ مخصوص تاثیر کوئی میکانی عمل نہیں ہے۔ لازماً اس کا انحصار فرد کی شخصیت، کردار، رویوں اور تعلق باللہ پر ہے۔ ایمان، ہجرت اور جہاد کی جو شاہراہ قرآن نے اہل ایمان کے لیے روشن کی ہے، اس پر چلنے میں یہ ذکر تقویت کا باعث ہوتے ہیں اور راہ کی مشکلات دور کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ذکر کرنے اور اس کے تقاضے پورے کرنے کی توفیق دے تاکہ ہم اس کے فائدے حاصل کر سکیں۔

آیات کے خواتیم کی حکمتوں پر مزید غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اس بحر کی تہ سے ایسے ایسے موتی نکلیں گے کہ عقل دنگ رہ جائے گی اور فکر کے اس آسمان پر ایسے ستارے چمکیں گے کہ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّھَا (الزمر ۳۹: ۶۹) (اور زمین اپنے رب کے نور سے روشن ہو جائے گی) کا منظر چار دانگ عالم کو منور کر دے گا۔

---

11 آپ کیسی تصویر دیکھتے ہیں؟

سیاست دان ہو یا جنرل، سرجن ہو یا تاجر، محقق ہو یا ادیب، افسر ہو یا کھلاڑی، کسی ادارے کا افسر ہو یا ملازم، تحریک کا قائد ہو یا کارکن --- سب کے لیے مشاہدہ ایک اہم ترین صلاحیت ہے۔ نتائج کا انحصار کارکردگی پر، کارکردگی کا فیصلوں پر، اور فیصلوں کا مشاہدے پر ہوتا ہے۔ مشاہدے کے عمل میں حالات کی تصویروں کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ فیصلے کرنے والے پہلے تصویریں بناتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے، پھر ان کی تعبیریں کرتے ہیں --- تعبیر کرتے ہوئے یہ دیکھنا چاہیے کہ تصویر کس نوعیت کی ہے۔ صحیح تصور کے بغیر فیصلہ کرنا غلط انجام کی طرف لے جاتا ہے۔

اس حوالے سے تصویروں کی یہ اقسام سامنے رہنا چاہییں:

- یک رخی / کئی رخی تصویر: حالات کا ہر رخ سے جائزہ لیا جائے۔
- ابتدائی / انتہائی تصویر: کسی معاملہ کی ابتدائی شکل اور انتہائی شکل دونوں سامنے رکھیں۔
- اندرونی / بیرونی تصویر: اندر کے حالات، باہر کے حالات دونوں کی مناسبت اہم ہے۔
- نئی / پرانی تصویر: حالات کا تازہ جائزہ اور پرانا جائزہ دونوں اپنی جگہ اہم ہیں۔
- خیالی / حقیقی تصویر: خیالات کی تصویر حقیقت کا روپ اسی وقت دھار سکتی ہے جب حقیقی تصویر اوجھل نہ ہو۔
- ساکت/متحرک تصویر: کسی خاص وقت کی صورت حال اور کسی مدت میں تسلسل کے ساتھ دیکھنا --- یہ تبدیلی کے عمل کو جاننے کے لیے ضروری ہے۔
- اپنی / دوسروں کی تصویر: جو تصویر ہم خود بناتے ہیں اور جو دوسرے بنا رہے ہیں، دونوں کا موازنہ ہونا چاہیے۔
- اوپر / نیچے کی تصویر: قائدین جو دیکھ رہے ہیں کیا وہی کارکنان دیکھ رہے ہیں۔ جو کارکنان دیکھ رہے ہیں کیا وہ قائدین کو معلوم ہے؟
- قریب / دور کی تصویر: فاصلے سے تفصیلات و تشریحات میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ غور سے دیکھنے والے اکثر دھوکا کھاتے ہیں۔
- پس تصویر / فوق تصویر: تصویر کے نیچے دیکھیں تو اسباب معلوم ہوں گے اور تصویر کے اوپر دیکھیں تو نتائج کا اندازہ ہوگا۔
- خاص / عام تصویر: محض عام تصویر کی حد تک رسائی سے معلومات ادھوری رہتی ہیں جب تک مقاصد کے پیش نظر مخصوص تصاویر نہ بنائی جائیں۔
- فطری / بناوٹی تصویر: جیسا ہے ویسا ہی پیش کیا جا رہا ہے یا حقائق کو بنا کر سامنے لایا جا رہا ہے؟
- جامع / محدود تصویر: مکمل احاطہ ہو گیا ہے؟ بڑا نقشہ بن گیا ہے یا کسی ایک دو چیزوں ہی پر نگاہیں مرکوز ہیں۔

اللہ تعالٰی ہمیں مشاہدے کی قوت دے۔ آمین!

نئی مطبوعات

۱۔ اسلامی جامعات	ظہیر الدین بھٹی (مترجم)
۲۔ حرمین الشریفین اور تبرکات نبویؐ	علی اصغر چوہدری
۳۔ سائنس خدا کے حضور میں	پروفیسر راؤ مختار احمد
۴۔ ذوالجلال والاکرام	شاہدہ ناز قاضی
۵۔ شعلۂ گفتار	محمد منیر افضل
۶۔ تفہیم القرآن کی تمثیلات و تشبیہات	ڈاکٹر محمد جنید
۷۔ تسہیل القرآن	میر محمد حسین
۸۔ قرآنی سورتوں کے موضوعات و مرکزی مضامین	امیر محمد حسین
۹۔ سیرت نبویؐ میں عورت کا کردار	پروفیسر عاصمہ فرحت
۱۰۔ امریکہ میں مسلمان اور ان کی قیادت	ابراہیم ہمدانی
۱۱۔ اسلام کی اخلاقی تعلیمات	عرفان حسن صدیقی
۱۲۔ احکام الٰہی	مرزا جاوید اقبال
۱۳۔ دعوت ایمان	محمد ندیم اعظم
۱۴۔ تفہیم الاسلام (نہم، دہم)	
۱۵۔ جدید ترکی میں اسلامی بیداری	ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی
۱۶۔ عالم عرب پر مشنری یلغار	ظہیر الدین بھٹی (مترجم)
۱۷۔ اسلام جدید دور میں	سلمان حسین خان

سود: عدل اور معاشی استحکام کا دشمن

ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا ○

ترجمہ: میاں محمد اکرم

اسلام سود (ربا) کے لین دین کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام ہی نہیں بلکہ دوسرے بڑے مذاہب' مثلاً یہودیت' عیسائیت اور ہندومت بھی اسے حرام کہتے ہیں۔ بائبل میں سود (interest) اور ربا (usury) میں کوئی فرق نہیں [1] اور سود لینے والوں کو مکار (wicked) کہا گیا ہے [2]۔ قرآن پاک بھی اسے حرام قرار دیتا ہے اور اعلان کرتا ہے: جو لوگ سود خوار ہیں' وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ حالت جنگ میں ہیں (البقرہ ۲: ۲۷۹)۔ سود کی حرمت پر تمام بڑے مذاہب کے یکساں سخت موقف کے پیچھے بہت مضبوط عقلی استدلال ہونا چاہیے۔ اس استدلال کو آج بھی اسی طرح مؤثر ہونا چاہیے۔

سود کی حرمت کے بارے میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ سود غریبوں کے لیے باعث آزار ہے اور عدل کے تقاضوں کے منافی ہے' لیکن سود کے خلاف یہی ایک عقلی دلیل نہیں ہے۔ رسولؐ اللہ کے زمانے میں قرض صرف غریب ہی حاصل نہیں کرتے تھے بلکہ قبائل اور تجارت پیشہ امرا بھی بڑے پیمانے پر شراکتی بنیادوں پر تجارت کرنے کے لیے قرض پر رقوم حاصل کرتے تھے۔ یہ ان حالات کا تقاضا تھا۔ مشکل راستوں' سخت موسمی حالات اور رسل و رسائل کے سست ذرائع کی وجہ سے تجارتی کاروانوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا' اور اس پر وقت بھی زیادہ صرف ہوتا تھا۔ مشرق یا مغرب کی طرف ایک سال کے دوران ایک سے زائد تجارتی سفر کرنا ممکن نہ تھا۔ رقم لمبے عرصے تک منجمد رہتی تھی۔ اس لیے کاروان تمام دستیاب وسائل کو مقامی برآمدی مال کی خرید کے لیے استعمال کرتے' اس تمام مال کو بیرون ملک فروخت کرتے' اور اسی عرصے کے دوران بیرون ملک سے مقامی ضرورت کی تمام اشیا خرید کر لے آتے۔

○ سینئر اکنامک ایڈوائزر' سعودی عرب مونیٹری ایجنسی (SAMA)۔ ۱۹۸۹ میں انھیں دو بین الاقوامی ایوارڈ شاہ فیصل ایوارڈ' اور اسلامک ڈویلپمنٹ بنک ایوارڈ دیے گئے۔

اسلام سے پہلے وسائل کا محرک سود تھا۔ اسلام نے سرمایہ لگانے والے اور کاروباری فرد کے درمیان سود پر مبنی تعلق کو یکسر ختم کر دیا' اور اسے نفع اور نقصان کی بنیادوں پر استوار کیا۔ اس سے سرمایہ لگانے والا شخص کاروبار میں مناسب حصہ دار بن جاتا ہے اور رہزنی وغیرہ کی وجہ سے ہونے والے نقصان کی بنا پر مالی طور پر تباہ نہیں ہو جاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گو اسلام کے نظام اقدار میں غریبوں کی مدد کرنے کو بہت زیادہ ترجیح دی گئی ہے' لیکن یہ سود کی حرمت کی واحد وجہ نہیں ہے۔ سب سے بنیادی وجہ سماجی و معاشی انصاف کی فراہمی ہے' جسے قرآن پاک تمام انبیا کی بعثت کا بڑا مقصد قرار دیتا ہے (الحدید ۵۷: ۲۵)۔

عدل محض ایک اصطلاح نہیں ہے۔ اس کے بہت سے عملی پہلو ہیں' جن میں سے سب سے اہم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو عطا کردہ وسائل کو اس طرح سے استعمال میں لایا جائے' کہ لوگوں کو بنیادی ضروریات کی فراہمی' مکمل روزگار' آمدنی و دولت کی منصفانہ تقسیم اور معاشی استحکام کے اعلیٰ انسانی مقاصد حاصل کیے جا سکیں۔

اہم بات یہ ہے کہ انسانیت کی بھلائی کے یہ مقاصد انسانیت نواز حکمت عملی اختیار کیے بغیر حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ یہ حکمت عملی صرف سود کے خاتمے پر مبنی نہیں ہے' لیکن یہ اس کا اہم حصہ ضرور ہے۔ اس مقصد کے لیے مالیاتی اداروں کو ایکویٹی (equity) اور نفع و نقصان میں شراکت کی بنیادوں پر از سرنو ڈھالنا ہو گا' اور سرمایہ لگانے والے شخص کو نقصان اور نفع میں شریک کرنا ہو گا' اور اس کو کاروبار کے انجام سے قطع نظر' پہلے سے طے شدہ شرح منافع کا یقین نہیں دلایا جا سکے گا۔

۱۔ **کفالت عامہ**: سودی بنیادوں پر چلنے والے مالیاتی ادارے' قرض لینے والوں کے درمیان وسائل کی تخصیص کرتے ہوئے ان کی طرف سے مناسب ضمانت طلب کرتے ہیں کہ قرض خواہ ان کو نہ صرف اصل رقم لوٹا دے گا بلکہ اس کے پاس اتنی رقم ہو گی کہ کچھ زائد بھی ادا کر سکے گا۔ مالیاتی وسائل کا کیا استعمال ہو گا؟ یہ بنیادی اور فیصلہ کن عامل نہیں ہوتا۔ اس طرح مالیاتی وسائل کا رخ یا تو امیروں کی طرف ہوتا ہے' جو دونوں قسم کے معیارات پر پورا اترتے ہیں' یا حکومت کی طرف' جس کے بارے میں تصور ہے کہ وہ کبھی دیوالیہ نہیں ہوتی۔

تاہم امیر نہ صرف سرمایہ کاری کے مقاصد کے لیے قرض حاصل کرتے ہیں بلکہ دکھاوے اور نمایشی خریداری اور سٹہ بازی کے لیے بھی قرض حاصل کرتے ہیں اور حکومتیں بھی صرف ترقیاتی مقاصد اور عوامی فلاح و بہبود کے لیے ہی نہیں' بلکہ دفاع کے نام پر جنگی ہتھیاروں اور سفید ہاتھی جیسے منصوبوں کے لیے بھی قرض حاصل کرتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف غیر پیداواری اور مسرفانہ اخراجات بڑھتے ہیں بلکہ ملکی معیشت اور بیرونی ادائیگیوں پر اثر پڑتا ہے' اور بنیادی ضروریات کی فراہمی اور ترقی کے لیے وسائل میں کمی آتی ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امریکہ جیسے امیر ترین ممالک' ہر طرح کے وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود اپنے تمام عوام کو بنیادی ضروریات فراہم کرنے سے کیوں قاصر ہیں۔

۲۔ **مکمل روزگار:** غیرپیداواری اور مسرفانہ اخراجات کے نتیجے میں--- جو سود پر مبنی مالیاتی اداروں کی وجہ سے فروغ پاتے ہیں--- دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں بچتوں میں کمی آئی ہے' حتیٰ کہ صنعتی ممالک میں بھی ۱۹۶۰ اور ۱۹۸۰ کے برسوں کے دوران خالص قومی بچت میں قومی آمدنی کے مقابلے میں چار فی صد کمی واقع ہوئی ہے [۳]۔ دنیا بھر میں بچتوں میں کمی کی وجہ سود کی حقیقی بلند تر شرح ہے۔ جس کے نتیجے میں سرمایہ کاری' ترقی اور بے روزگاری کی کم تر شرح وجود میں آتی ہے۔ بے روزگاری اس وقت دنیا کے تمام ممالک (بشمول صنعتی ممالک) کے لیے بہت ہی اہم مسئلہ ہے۔ ۹۰-۱۹۸۸ میں' او ای سی ڈی اور یورپ میں بے روزگاری کی شرح ۸.۶ فی صد تھی' جو ۷۳-۱۹۷۱ کے ۲.۹ فی صد کے مقابلے میں تین گنا زائد ہے [۴] اور مستقبل قریب میں اس کا اس سطح سے کم ہونا محال نظر آتا ہے۔ کیونکہ بے روزگاری کو بڑھنے سے روکنے کے لیے شرح نمو کا ۳.۵ فی صد ہونا ضروری ہے' جب کہ یورپ میں ۱۹۷۶ کے بعد سے لے کر آج تک شرح ترقی اس سے کم تر سطح پر ہے۔

زیادہ قابل تشویش بات یہ ہے کہ یہ بے روزگاری زیادہ تر نوجوانوں میں پائی جاتی ہے' اس سے ان کی انا مجروح ہوتی ہے' مستقبل پر ان کے یقین کو متزلزل کرتی ہے' معاشرے سے ان کی دشمنی کو بڑھاتی ہے' ان کی ذاتی اور مخفی صلاحیتوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔

مکمل روزگار کی سطح کے حصول کے امکانات بجٹ کے تقاضوں' افراط زر بڑھنے کے اندیشوں اور مستقبل میں کم شرح ترقی کے جاری رہنے کی وجہ سے روشن نظر نہیں آتے۔ مسرفانہ اخراجات میں کمی اور بچت اور سرمایہ کاری میں اضافہ' اس میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک نجی اور سرکاری سطح پر معاشرتی اقدار اپنی چادر سے باہر پاؤں پھیلانے کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں اور سود پر مبنی مالیاتی ادارے قرض کے استعمال کو پیش نظر رکھے بغیر قرض کی سہولت دے کر اسے ممکن بناتے ہیں۔ تاہم اگر سود کو ممنوع قرار دے دیا جائے اور بنکوں کو سرمایہ کاری کے نفع اور نقصان دونوں میں شریک کروایا جائے تو وہ قرض دینے کے معاملے میں زیادہ محتاط ہوں گے' مسرفانہ اخراجات میں کمی آئے گی' پیداوارانہ سرمایہ کاری اور ترقی کے لیے زیادہ وسائل مہیا ہوں گے۔ اس کا نتیجہ زیادہ ترقی اور روزگار کے مواقع میں اضافے کی صورت میں نکلے گا اور بہ تدریج بے روزگاری میں کمی واقع ہو گی۔

۳۔ **وسائل کی منصفانہ تقسیم:** سود پر مبنی روایتی مالیاتی نظام میں مالیاتی وسائل کی غیر منصفانہ تخصیص عام طور پر تسلیم نہیں کی جاتی۔ آرن بگسٹن (Arne Bigsten) کے مطابق: "سرمایہ کی تقسیم زمین سے بھی زیادہ غیر مساوی بنیادوں پر ہے اور بنک کاری نظام اس غیر مساوی تقسیم میں مزید اضافہ کرتا ہے

(۵)- اس کی وجہ یہ ہے کہ سود پر مبنی مالیاتی ادارے زیادہ تر منصوبے کی پائیداری یا مالیات کے استعمال کو پیش نظر نہیں رکھتے بلکہ ان کے پیش نظر قرض کی واپسی کی ضمانت ہوتی ہے۔

بنکوں کی امانات (deposits) زیادہ تر معاشرے کے مختلف طبقات فراہم کرتے ہیں' لیکن اس کے فوائد زیادہ تر طبقہ امرا ہی سمیٹتا ہے۔

مشان (Mishan) نے بالکل درست کہا ہے: "دولت میں تفاوت بہت زیادہ ہے اور قرض دینے والے کے لیے یہ غیر منطقی رویہ ہو گا کہ وہ معاشرے کے امیر لوگوں کی طرح نادار افراد کو بھی قرض دے' یا دونوں کو ایک جیسی شرائط پر ایک جیسی رقوم فراہم کرے" (۶) - امریکہ کے چھٹے بڑے بنک "دی مورگن گارنٹی ٹرسٹ کمپنی" نے اعتراف کیا ہے کہ بنک کاری نظام چھوٹی کمپنیوں اور کاروباری سرمایہ کاروں کو مالیات کی فراہمی میں ناکام ثابت ہوئے ہیں اور فنڈ کی بہتات کے باوجود مقابلے کی قیمت (سود) پر بڑی کمپنیوں کے سوا دوسروں کو فنڈ (وسائل) فراہم کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے (۷)۔

اسلامی مالیاتی نظام مساویانہ شرکت کے حصول کے لیے زیادہ مفید ہے۔ نفع نقصان میں شرکت اور مالیات فراہم کرنے والے (ادارے) کو کسی بھی منصوبے کے مضبوط ہونے کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرے گی اور اس کے نتیجے میں غریب لیکن مقابلے پر آنے والے آجر بھی مالیات حاصل کر سکیں گے' بشرطیکہ ان کے منصوبے مناسب ہوں۔ علاوہ ازیں چھوٹے اور درمیانے درجے کے بہت سے کاروبار بھی مالیاتی اداروں سے رقومات حاصل کر سکیں گے' بغیر اس کے کہ وہ ضمانت (collateral) فراہم کریں۔ اس کے نتیجے میں معاشرے کو غریب لوگوں کی کاروباری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا اور ان کی طرف سے پیداوار' روزگار اور لوگوں کی ضروریات کی تکمیل میں جو قیمتی کردار ادا کیا جا سکتا ہے' اس کا انھیں موقع ملے گا۔

اس قسم کے مالیات میں قرض کے نقصان کے بارے میں تشویش بلاوجہ ہے۔ زرعی ترقی کے لیے بین الاقوامی فنڈ کا تجربہ یہ ہے کہ غریبوں کو کاروباری مقاصد کے لیے دیا جانے والا قرض ان کی آمدنی میں سے زیادہ تیزی سے واپس کیا جاتا ہے (۸) - چھوٹے قرض کے معاملات میں اسی طرح کے نتائج دیگر مختلف ممالک میں سامنے آئے ہیں۔

۴- **معاشی استحکام**: آج کی معاشی دنیا میں شرح سود غیر مستحکم کرنے والا عنصر ہے۔ نوبل انعام یافتہ معیشت دان ملٹن فریڈمین نے امریکی معیشت کی ناہمواریوں کا سبب شرح سود میں اتار چڑھاؤ کو قرار دیا ہے۔ زیادہ شرح سود سرمایہ کاری کی منڈی میں بہت زیادہ غیر یقینی کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ یہ کل سرمایہ کاری شدہ سرمایہ پر کل منافع (سود + منافع) میں مسلسل اتار چڑھاؤ لاتی ہے اور یہ طویل المدتی سرمایہ کاری کے متعلق فیصلوں کو پورے اعتماد کے ساتھ کرنے کو مشکل بناتی ہے۔

شرح سود کی بدلتی شرحیں قرض لینے والوں، معیشت کے مختلف شعبوں اور مختلف ممالک کے درمیان مالیاتی وسائل کے اتار چڑھاؤ کا سبب بنتی ہیں، اور قرض پر مبنی سرمایہ کاری اور شرح مبادلہ میں غیر موزوں تبدیلیوں کا باعث بنتی ہیں۔ تغیر پذیر شرح مبادلہ کے نظام میں سود کی شرح میں ہر تبدیلی، کاروباری ناکامیوں کی شرح میں اضافے کا سبب بنتی ہے جس کی وجہ کاروباری افراد کی غیر مستعدی یا سستی نہیں بلکہ کاروباری منافع میں کمی ہے۔ کاروبار کی ناکامی کا مطلب نہ صرف کاروباری لوگوں کا اور سٹاک ہولڈرز کا مالیاتی نقصان ہے بلکہ اس کا نتیجہ روزگار، پیداوار، سرمایہ کاری اور پیداواری صلاحیت میں دور رس اثرات اور ناقابل تلافی کمی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ بلاشبہ ان تمام عوامل کے معاشی سرگرمی اور استحکام پر بہت اہم اثرات مرتب ہوتے ہیں، جب کہ مکمل طور پر حصہ داری کے نظام میں، کاروبار کے کل منافع میں سے آجر کا منافع، شرح منافع پر اور کاروبار کے آخری نتیجہ پر منحصر ہے۔ آجر اور سرمایہ کار کے درمیان منافع میں شراکت کی شرحیں سود کی طرح روز روز تو کیا مہینوں تک تبدیل نہ ہوں گی، کیونکہ اس کا تعین معروف طریقے اور مروج طریقے اور عدل کے تقاضوں کے پیش نظر ہوگا اور کاروباری معاہدے کے اختتام تک اسی سطح پر رہے گا۔ چونکہ کاروبار کا انجام کئی عوامل پر منحصر ہوتا ہے، اور غیر موزوں طور پر تبدیل نہیں ہوتا۔

قرضہ جاتی معیشت کے مقابلے میں حصہ داری کی بنیاد پر قائم معیشت زیادہ مستحکم ہوگی۔ اس بات کا اعتراف کئی مشہور و معروف مغربی معیشت دانوں نے کیا ہے جن میں ہائمن سائمنز، ہائمن منسکی اور جان رابنسن شامل ہیں (۱۰)۔

خلاصہ بحث: یہ بات کسی پس و پیش کے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ کسی بھی ایسے نظام کے لیے جو انسانی بھائی چارے پر یقین رکھتا ہو اور جس کا ہدف لوگوں کی کفالت عامہ، مکمل روزگار، آمدنی و دولت کی منصفانہ تقسیم اور معاشی استحکام ہو، سود کی حرمت لازمی جز کی حیثیت رکھتی ہے۔ نظام سرمایہ داری ان اہداف کا ادراک اس وجہ سے نہ کر سکا کہ اس نظام کے اہداف اور طریق کار میں بنیادی تفاوت پایا جاتا ہے۔ اس نظام کے اہداف، اپنے مذہبی پس منظر کی وجہ سے انسانیت پر مبنی ہیں، جب کہ اس کا طریق کار ڈارون کے بقائے اصلح (survival of the fittest) کے نظریے پر مبنی ہے۔

مختلف شعبوں میں وسائل کی تخصیص و تعیین کے سلسلے میں نظام سرمایہ داری بنیادی طور پر شرح سود کو پیش نظر رکھتا ہے، جس کا فائدہ طبقہ امرا کو پہنچتا ہے اور نتیجتاً نہ صرف ارتکاز دولت بلکہ مسرفانہ اخراجات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے کفالت عامہ کا ہدف نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے۔ بچتوں، سرمایہ کاری، روزگار اور پیداوار میں اضافے کی شرح سست پڑتی ہے، اور اس کے نتیجے میں بنی نوع انسان کی فلاح کے ہدف کا حصول ناکامی سے دوچار ہوتا ہے (بشکریہ مجلّہ سعودی ایرلائنز: اہلاً وسہلاً اکتوبر ۱۹۹۴ء)۔

حواشی

1. James Hastings, *Encyclopaedia of Religion and Ethics* (New York: Charles Seribner's Sons n.d.) Vol. 12, pp 555. See also John Noonan, *The Scholastic Analysis of Usury* (Cambridge, Mass: Harvard Univ. Press, 1957) p 20.

2. See: The Bible - Ezekiel, 18:8, 13, 7;22:12. See also Exodus, 22:25-27; Leviticus, 25:36-38; Deuteronomy, 23:19; Luke, 6:35.

3. See: Bank of International Settlements, *61st Annual Report*, 1 April 1990 - 31 March 1991, Basle 10 June 1991, p.32. See also OECD *Economic Outlook*, December 1991, p.21.

4. OECD *Economic Outlook*, December 1991, Tab.2, p.7.

5. Arne Bigsten, `Poverty, Inequality and Development, in Norman Gemell, *Surveys in Development Economics* (Oxford: Basil Blackwell, 1987), p 156.

6. E.S. Mishan, *Cost Benefit Analysis:* An Intorduction (New York, Praeger, 1971), p 205.

7. Morgan Guarantee Trust Co. of New York, *World Financial Markets*, January 1987, p .7.

8. See: *The Economist*, 16 February 1985, p.15.

9. Milton Friedman, 'The Yo-Yo US Economy', *Newsweek*, 15 February 1982, p.4.

10. Henry Simons, Economic Policy for a Free Society (Chicago Univ. of Chicago Press, 1948), p. 320.

Hyman Minsky, *John Maynard Keynes* (New York; Columbia Univ. Press, 1975) See also: Summary of Minsky's argument cited by Joan Robinson in `What are the Questions?', *Journal of Economic Literature*, December 1977, p .1331. The quotation on the instability of credit is from C.P. Kindleberger, *Manias, Panics, and Crashes* (London MacMillan, 1978), p.16.
Joan Robinson, op.cit. p.1331

ہمارے معاشرے کی عورت اور اسلام

ڈاکٹر طاہرہ بشارت ○

ہر معاشرے میں عورت کئی روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے، اور ہر روپ میں وہ اپنا ایک کردار رکھتی ہے۔ معاشرہ مذہبی ہو یا سیکولر، طبقاتی ہو یا غیر طبقاتی، عورت کو ہر حال میں اپنا کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ نوع کے اعتبار سے اگرچہ مرد اور عورت یکساں حیثیت رکھتے ہیں مگر جنس کے اعتبار سے دونوں جدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ صنف نازک ہونے کے ناطے عورت کا دائرہ کار مرد سے الگ ہے۔ دور قدیم سے آج تک عورت کی اس حیثیت کا لحاظ کیا جاتا رہا ہے اور اس کو اس بنا پر خصوصی مقام و احترام اور مراعات حاصل رہی ہیں مگر معاشرتی بگاڑ کی وجہ سے عورت کی یہ کمزور حیثیت اس کے لیے وبال جان بھی بنتی رہی ہے۔ جس طرح ظالم سماج میں طاقت ور کمزوروں کو اپنے ظلم کا نشانہ بناتے ہیں اور ظلم اور حق تلفی کا یہ سلسلہ اوپر سے نیچے تک ہر سطح پر سرایت کر جاتا ہے، اسی طرح عورت بھی اس ظلم کا نشانہ بنتی ہے۔ وہ اپنے حقوق سے محروم کر دی جاتی ہے اور اسے ہر قسم کے ظلم سہنے کے لیے زندہ رہنا پڑتا ہے۔ ایک طویل عرصہ اسی حالت میں گزارنے کی وجہ سے وہ اس صورت حال کو اپنا مقدر سمجھ لیتی ہے اور پھر یہ کیفیت اس کی فطرت بن جاتی ہے۔

بگڑے ہوئے معاشروں میں عورت پر ظلم کی یہ سیاہ رات ہمیشہ طاری نہیں رہتی بلکہ ہر دور میں ظلم و ناانصافی کے نظام کے خاتمے کے ساتھ ساتھ عورت کے حقوق کی بحالی کی جدوجہد بھی ہوتی رہتی ہے۔ حقوق کی یہ جدوجہد کبھی تو متوازن رہی مگر اکثر اوقات افراط و تفریط کا شکار ہوتی رہی ہے۔ عورت پر ظلم کا ایک دور آج سے ۱۴سو برس قبل گزرا جب وہ مرد کے ہاتھوں کھلونا بن چکی تھی، جب اس کا کوئی حق نہ تھا، جب وہ حیوانوں کی طرح منڈیوں میں فروخت ہوتی تھی، جب اسے مویشیوں کی طرح گھروں سے بچوں سمیت ہانک کر اپنے قبضے میں کر لیا جاتا تھا، جب وہ جایداد کی طرح اولاد میں تقسیم ہوتی تھی،

○ اسسٹنٹ پروفیسر، ادارہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

جب باپ اسے اپنے مالی مفادات کے تحفظ کی بھینٹ چڑھانے میں عار محسوس نہ کرتا تھا' جب مرد اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا تھا اور وہ مکمل طور پر مرد کے رحم و کرم پر زندگی کے دن کاٹنے پر مجبور تھی۔ ستم کی یہ تاریکی تب چھٹی اور حق کی ایک کرن اس وقت نمودار ہوئی جب عورت نے محمد عربیؐ کو اسلامی نظام کے علم بردار کی شکل میں اپنے حقوق کا محافظ و نگہبان پایا۔ اور اس معاشرے میں ظلم سہنے والی یہ کمزور مخلوق اپنے حقوق کی حفاظت اور اسلامی نظام عدل کے قیام کے لیے غاصبوں کے سامنے فولادی دیوار بن گئی۔

اسلامی معاشرے میں عورت کو زندہ رہ کر معاشرے کی تعمیر میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کا حق دیا گیا۔ اس کے مقام کا تعین ہوا۔ اس کو ذات کی پہچان ملی۔ اس کی عصمت و عزت کو تحفظ ملا۔ اس کی مرضی کو اعتبار ملا۔ اسے مال میں ملک اور اس کے تصرف میں اختیار ملا۔ اس کے فرائض بھی تھے اور حقوق بھی۔ اور ان حقوق کی حفاظت کا انتظام صرف اخلاقی وعظ یا معاشرتی دباؤ ہی کی صورت میں نہ تھا بلکہ عدلیہ اور انتظامیہ کے ذریعے ان حقوق کے تحفظ کی باقاعدہ ضمانت مہیا کی گئی تھی۔

اسلام نے عورت کو ماں کا درجہ دیا تو جنت اس کے قدموں میں رکھ دی۔ بہن کا درجہ دیا تو شفقت و محبت اس کا حق ٹھہرایا۔ بیٹی کا روپ دیا تو وہ رحمت و مودت کی مستحق قرار پائی۔ بیوی کے روپ میں دیکھا تو اس کے بھی ویسے ہی حقوق مقرر فرمائے جیسے حقوق کی ادائیگی کا مطالبہ اس سے کیا جاتا ہے۔ معاشرے کو اس کے احترام' اس کی حفاظت اور اس کی شخصیت کی نشوونما میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کا ذریعہ بنایا۔ لیکن پھر مرور ایام سے اسلامی معاشرے میں بھی بگاڑ پیدا ہوا اور اسلامی تعلیمات پس پشت ڈالی جانے لگیں' تو عورت کے حقوق بھی پامال ہونے لگے۔ مسلم معاشرے میں عورت کو پھر اس مقام کی طرف دھکیل دیا گیا اور بعض صورتوں میں اس مقام سے بھی نیچے گرا دیا گیا جس پر یہ آج سے ۱۴ سو برس قبل گری ہوئی تھی' اور جہاں سے ہمارے پیارے نبیؐ نے اسے اٹھا کر عزت' احترام' عظمت اور برابری کے اونچے مقام پر پہنچایا تھا۔

پھر پسی ہوئی عورت کے حقوق کی بحالی کی ایک تحریک مغرب سے اٹھی۔ یہ تحریک چونکہ انسانی کوششوں کا نتیجہ تھی اور ردعمل کے طور پر وجود میں آئی تھی' اس لیے اس کے نتیجے میں عورت کو جو مقام ملا وہ ردعمل کے اثرات سے پاک نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی تہذیب میں حقوق کا پلڑا عورت کے حق میں جھک گیا اور بعض صورتوں میں عورت محروم حقوق ہی رہی۔ مرد و عورت کی مساوات کے نعرے نے عورت پر اس کی استطاعت سے بھی زیادہ بوجھ ڈال دیا جو اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں حقوق نسواں کی جو تحریک مغرب کے زیراثر پروان چڑھی' اس نے عورت کو ایسا بنانا چاہا جیسا کہ مغربی عورت ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے کی وابستگی اسلام کے ساتھ بڑی گہری ہے۔ اس لیے حقوق نسواں کی

مغربی تصورات پر مبنی تحریک بہت محدود سے حلقے میں ہی اپنا اثر ڈال سکی ہے' جب کہ دوسری طرف اسلامی حقوق کی علم بردار خواتین کی تنظیمیں ابھی تک تعداد میں بہت کم اور اثرات میں بڑی محدود ہیں۔ چنانچہ ہمارے معاشرے کی عورت استحصال کا شکار' اپنے مقام و مرتبے سے ناآشنا' ظلم سہنے کی عادی' مغربی تصورات کے مطابق آزادی اور اسلامی نظریات کے مطابق حقوق کے مطالبوں کے درمیان کی حالت میں ہے۔ دور حاضر میں اس کا عملی مقام یہیں کہیں بنتا ہے لیکن اس کا اصلی مقام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں پوشیدہ ہے جس کا ظاہر ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ یہاں حقیقی اسلامی معاشرہ کب وجود میں آتا ہے۔ لہٰذا مسلم خواتین کو اپنے حقوق کے حصول کی ادھوری جدوجہد کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرے کے قیام کی بھرپور جدوجہد بھی کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنے حقیقی مقام' متوازن حقوق اور عظمت و وقار سے مستفیض ہو سکیں۔

حقیقی اسلامی معاشرے میں عورت کے مقام و مرتبے کو وضاحت سے بیان کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے بارے میں دیگر مذاہب اور معاشروں کی سماجی اقدار کا تذکرہ بھی ہو جائے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ ہر قوم اپنے دور عروج میں جو دراصل اس کا دور علم و عرفان ہوتا ہے' یقیناً روشن' متناسب اور معتدل نقطۂ نگاہ کی حامل ہوتی ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی سوچ میں پستی' فکر میں جمود' خیالات میں تعصب اور نقطۂ نظر میں تنگی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ کسی قوم کی اس حالت کی انتہائی سطح دراصل اس کا زوال اور دور جہالت ہوتا ہے۔ اس اصول کا اطلاق اگر عورت کے بارے میں مذاہب اور معاشروں کے نقطۂ نظر پر کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ عورت کے مقام و حیثیت کے بارے میں درج ذیل بیانات دراصل ان مذاہب اور معاشروں کے دور زوال اور دور جمود کی پیداوار ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح اسلام نے اپنے دور اول و عروج میں عورت کو جس بلند مرتبے اور مقام کا مستحق قرار دیا' دور زوال میں مسلمانوں کی مقدس کتب میں ان کا تذکرہ ملتا ہے مگر مسلم معاشروں میں اس کو بالفعل دیکھنا چاہیں تو مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

عورت کے بارے میں دیگر مذاہب و معاشروں کے نقطہ ہاے نظر ملاحظہ فرمایئے:

یونان: یونانی عموماً عورت کو ایک کم درجے کی مخلوق سمجھتے ہیں۔

روم: مرد کی حکومت اپنی بیوی پر جائز تھی--- جس کا معاشرت میں کوئی حصہ نہ تھا اور شوہر کو پورا حق اس کی جان پر بھی حاصل تھا اور یہی حال یونان کا بھی تھا۔

ہندو قانون: تقدیر' طوفان' موت' جہنم' زہر' زہریلے سانپ' ان میں سے کوئی چیز اتنی خراب نہیں جتنی عورت۔

مسیحی قانون: ایک ناگزیر برائی، ایک پیدایشی وسوسہ، ایک مرغوب آفت، ایک خانگی جھگڑا، ایک غارت گر و دلربائی اور ایک آراستہ حقیقت۔

اطالوی قول: عورت اچھی ہو یا بری، اسے مار کی ضرورت ہے۔

اب ہم اسلام کی ان تعلیمات کا ذکر کریں گے جن میں عورت کے مقام پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ساتھ ہی مسلم معاشرے میں اس کی عملی حالت کا تذکرہ بھی کریں گے تاکہ موازنہ ہو سکے کہ اسلام عورت کے بارے میں کیا ہدایات دیتا ہے مگر مسلم معاشرے میں اسے کیا بنا کے رکھا گیا ہے۔

عورت انسان ہے: اسلام عورت کو مکمل انسان قرار دیتا ہے۔ اس نے جہاں بھی یاایھا الناس یا یا ایھا الذین امنوا کہہ کر خطاب کیا وہاں مرد اور عورت دونوں مراد لیے جاتے ہیں۔ پیدایش کے اعتبار سے بھی مرد اور عورت برابر ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے: اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا--- ذمہ داری کے اعتبار سے بھی مرد و عورت یکساں ہیں۔ قرآن حکیم کے نزدیک شیطان نے ان دونوں کو بہکایا، دونوں کو شجر ممنوعہ کا پھل کھلایا، پھر دونوں نے اللہ کے حضور توبہ کی۔ عمل کے بدلے میں بھی مرد و عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قرآن حکیم بتاتا ہے کہ جو کوئی بھی نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت وہ بدلے سے محروم نہ رہے گا۔ اسی طرح پابندی قانون میں بھی مرد و عورت میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ معاشرے کی اصلاح کی ذمہ داری میں بھی دونوں یکساں شریک ہیں۔

مرد و عورت میں اشتراک کے مندرجہ بالا تمام پہلو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اسلام میں عورت ایک مکمل شخصیت کی مالک ہے، ناقص العقل ہے اور نہ تابع مہمل۔ اس کی ذات کے لیے نشوونما اور اس کی شخصیت کے لیے اظہار کے مواقع اسی طرح حاصل ہونے چاہییں جس طرح مرد کو حاصل ہیں۔ لیکن ہمارے معاشرے میں عورت کو مکمل انسان سمجھنے کے بجائے جزوی انسان سمجھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی ذات کے بہت سے گوشے اور پہلو اپنے اظہار سے محروم رہتے ہیں۔ عورت بھی اپنے جزوی کردار پر راضی ہو کر ادھوری شخصیت بن چکی ہے۔ اس کے اندر کی مکمل شخصیت خود اس پر بھی ظاہر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو مکمل انسان بنانے کے بجائے جزوی انسان بنے رہنے پر راضی رہتی ہے۔ وہ دبکی ہوئی، خوف زدہ اور زندگی کے محدود دائرے میں کردار ادا کرنے والی ذات بنی رہتی ہے۔

ہمارے معاشرے میں مردوں کا عورتوں کے بارے میں مخصوص منفی نقطۂ نظر، آوارہ لڑکوں کا لڑکیوں کے پیچھے بھاگنا، انھیں ستانا، غلط نظروں سے دیکھنا جیسے قبیح افعال بھی معاشرے میں عورت کی حیثیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اگر عورت کو ایک صاحب الرائے، صاحب ارادہ و شعور ہستی، اور ایک ایسا مکمل انسان سمجھا جائے جس کی اپنی پسند و ناپسند ہوتی ہے، جو کسی چیز کو اختیار یا ترک کرنے کا حق رکھتی ہے، تو غلط

نگاہوں سے دیکھنے والا ہزار بار سوچے گا کہ جسے میں نگاہ غلط سے دیکھ رہا ہوں خود وہ میرے بارے میں کیا رائے قائم کرے گی۔ ہمیں عورت کو اپنی ذات پر اعتماد دینا' اسے خوف سے نجات دلانا' اسے بہادر بنانا' اور اسے ہر قسم کے استحصال سے بچانا ہو گا۔ جبھی وہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کے مطابق مکمل انسان کا کردار ادا کرنے کے قابل ہو سکے گی اور اس کی شخصیت کے دبے ہوئے گوشے ابھر کر سامنے آ سکیں گے۔

حق ملکیت و تصرف : ملکیت کے حق میں بھی مرد و عورت دونوں برابر کے شریک ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے: مردوں نے جو کمایا' اس میں ان کا حصہ ہے اور عورتوں نے جو کمایا اس میں ان کا حصہ ہے--- آمدنی کے لیے جدوجہد کرنے اور کوئی پیشہ اختیار کرنے کا حق جس طرح مرد کو ہے اسی طرح عورت کو بھی حاصل ہے۔ عہد نبویؐ میں عورتیں کھیتی باڑی میں حصہ لیتی تھیں' جانور چراتی تھیں' سلائی اور دوسرے پیشوں کے ذریعے بھی کماتی تھیں' نیز بیماروں اور زخمیوں کا علاج بھی کرتی تھیں۔ ہمارے معاشرے میں طبقہ خواص میں تو عورتیں بالکل کام نہیں کرتیں البتہ ان کے نام جایداد اور دیگر اموال وغیرہ ہوتے ہیں مگر ان میں تصرف کا حق انھیں شاذ ہی ملتا ہے۔ طبقہ خواص میں بہت قلیل سا گروہ ہو گا جس میں عورت کو حق ملکیت اور اپنی ملکیت میں تصرف کا اختیار بھی حاصل ہو۔ طبقہ غربا اور متوسط میں عورتیں تمام شعبوں میں بھرپور کام کرتی ہیں۔ اس طبقے کی عورت محنت مزدوری سے لے کر اعلیٰ عہدوں تک ہر جگہ اپنا خون پسینہ ایک کیے ہوئے نظر آتی ہے مگر المیہ دیکھیے کہ بیش تر صورتوں میں اسے اپنی ہی کمائی پر حق ملکیت حاصل ہے نہ حق تصرف۔

اس اعتبار سے ہمارے معاشرے کی عورت بہت مظلوم ہے۔ ایسا بھی عام ہے کہ شوہر اور بیوی دونوں دن بھر کی ملازمت کے بعد بہ یک وقت گھر میں داخل ہوئے اور گھر آکر شوہر روایتی خاوند بن گیا اور عورت کو روایتی بیوی بن کر گھر بھی سنبھالنا پڑتا ہے' بچوں کی طرف بھی توجہ دینا پڑتی ہے' شوہر کی خدمت بجا لانا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے' اور شوہر کے رشتے داروں کی خدمت بھی درجہ بدرجہ اس کے فرائض ٹھہرتے ہیں۔ ان تمام بوجھوں کے ساتھ وہ اپنے تمام فرائض تو ادا کرتی ہے لیکن روایتی معاشرے میں اس کے حقوق کی آواز کہیں سے سنائی نہیں دیتی۔ یہ سراسر غیر اسلامی روایت ہے جس میں مسلم معاشرے کی عورت بری طرح جکڑی ہوئی ہے۔

حق وراثت : اسلام نے عورت کو ورثے میں حق دار ٹھہرایا ہے۔ بیٹی ہونے کی حیثیت سے وہ بھائیوں کی شریک ہے۔ ماں کی حیثیت سے وہ باپ کے ساتھ شریک ہے اور شوہر کی وراثت میں بھی بیوی کا حصہ مقرر ہے۔ یہ حصے قرآن حکیم نے مقرر کیے ہیں۔ ان کا عورت سے چھیننا حدود الٰہی کی خلاف ورزی ہے۔ حدود اللہ کی خلاف ورزی کرنے والے کو اللہ نے وعید شدید سے ڈرایا ہے۔ وراثت میں عورت کے حقوق

کی اہمیت اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ باپ کی وراثت کی تقسیم کے لیے لڑکی کے حصے کو بنیادی اکائی کا درجہ حاصل ہے۔ مگر ہمارے معاشرے میں عورت وراثت سے محروم ہے۔ عورت مالک نہیں بلکہ ملک سمجھی جاتی ہے۔ اسے مالک بننے سے محروم کرنا ہمارے معاشرے کا ایک اور ظلم ہے۔

معاشرتی قدر و منزلت اور وقار: معاشرتی قدر و منزلت اور عزت و وقار میں بھی عورت و مرد یکساں ہیں۔ سورۃ الحجرات میں تحفظ ناموس مرد و زن کے سلسلے میں ارشاد ربانی ہے کہ نہ مرد مردوں کا مذاق اڑائیں اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں۔ خاص طور پر عورت کی عزت کا تحفظ اسلامی معاشرے پر بطور خاص لازم ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاشرہ قائم فرمایا تھا اس کی ایک خصوصیت یہ بیان فرمائی تھی کہ اکیلی عورت اپنے تمام زیورات سمیت حضرموت سے یمن تک سونا اچھالتی ہوئی سفر کرے گی، اسے خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہو گا۔ لیکن ہمارے معاشرے میں اس معیار کی جلوہ نمائی دیکھنا چاہیں تو سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

ایران و پاکستان میں عورتوں کے سلوک کا موازنہ کرتے ہوئے **لوح ایام** کا مصنف لکھتا ہے: یہاں (ایران میں) ہر روز ہزاروں عورتیں جلوس میں شامل ہوتی ہیں۔ غنڈہ گردی کرنے والے اور آوازیں کسنے والے نہ جانے کہاں گم ہو جاتے ہیں۔ انھیں ایرانی عورتوں کے دستے کے قریب کہیں دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ ادھر ہمارے گھر کی حالت یہ ہے کہ ۱۴ اگست کو جو گھرانے برقی قمقموں کی آرایش دیکھنے کے لیے باہر نکلتے ہیں، انھیں معاشرے کے تاریک ترین پہلو کا بھی نظارہ کرنا پڑتا ہے۔

ہمارے معاشرے کا تاریک ترین پہلو یہ بھی ہے کہ لڑکی کے گھر سے نکلنے کے ساتھ ہی والدین کی پریشانی شروع ہو جاتی ہے اور جب تک وہ بخیریت گھر واپس نہ پہنچ جائے، یہ پریشانی بڑھتی ہی رہتی ہے۔ ہمارے معاشرے کی یہ حالت اور اس میں عورت کے لیے خطرات قطعاً اسلامی تعلیم کے مطابق نہیں ہیں۔ عورت کے ساتھ اس نازیبا سلوک کی وجہ ہی سے کہا جاتا ہے کہ شریف عورتوں کو گھر میں ہی رہنا چاہیے۔ چنانچہ عورتوں کا گھروں سے نکلنا معیوب قرار پایا اور آوارہ گردوں کو معاشرے کے لاشعور نے ایک قسم کا الاؤنس یہ کہہ کر دے دیا کہ عورتوں کا کیا کام کہ وہ گھر سے باہر پھریں۔ اس کے لیے قرآن حکیم کی ایک آیت کے ایک حصہ سے دلیل بھی نکال لی گئی حالانکہ اس آیت میں جاہلیت کی زیب و زینت کے اظہار کے ساتھ گھروں سے نکلنے سے روکا گیا ہے۔ جہاں تک جائز ضروریات کے لیے گھروں سے نکلنے کا تعلق ہے اس کی نہ صرف اسلام کے نزدیک اجازت ہے، بلکہ بعض موقعوں پر حوصلہ افزائی بھی کی گئی ہے۔ لہٰذا معاشرے کا فرض ہے کہ وہ آوارہ گردوں کو نکیل ڈالے، ان سے عورت کو تحفظ مہیا کرے، اور ایسے

اقدامات کرے جس سے عورت بے خوف و خطر اپنے فرائض منصبی ادا کر سکے۔ البتہ عورت پر اسلام کے حجاب کے احکام کی پابندی لازمی ہے۔

حق مہر: مہر وہ معاوضہ ہے جو عورت اپنی آزادی کے عوض نقد یا جنس کی صورت میں مرد سے وصول کرتی ہے۔ یہ مال خالصتاً عورت کا حق ہے۔ اسے عورت ہی کی ملکیت میں رہنا چاہیے۔ وہ اس مال میں تصرف کی مختار ہے۔ کسی کو اس کے اس حق میں مداخلت کرنے کی اجازت نہیں۔ مہر عورت کا ایسا حق ہے جو اس میں خود اعتمادی اور عزت نفس پیدا کرتا ہے۔ اس کی مقدار کا تعین مرد کی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے جو وہ ادا کرنے کی استطاعت رکھتا ہو۔ تب جا کر وہ عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔ مالی بوجھ کے بدلے عورت کا بہ حیثیت بیوی حصول مرد پر یہ بات واضح کرتا ہے کہ عورت نہایت قیمتی متاع ہے۔ وہ قابل قدر ہستی ہے۔ اس کی حفاظت، اس کا احترام، اور اس کے ساتھ حسن سلوک کی اسے حتی المقدور کوشش کرنی چاہیے۔ اس طرح مشکل سے حاصل ہونے والی اپنی بیوی کی وہ قدر بھی کرے اور اس کا ہر لحاظ سے خیال بھی رکھے۔ وہ اپنی بیوی کے لیے حق طلاق استعمال کرتے ہوئے سوچے کہ وہ اس کو اپنے سے علیحدہ کرنے کے بعد دوسری بیوی حاصل بھی کر پائے گا یا نہیں۔

ہمارے معاشرے میں عورت کے اس اہم حق کو محض برائے نام چیز بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ ایک تو رقم معمولی، دوسرے اسے بھی معاف کر دینے کی غیر تحریری پابندی۔ مہر کی رقم وصول کرنا عورت کے لیے عیب بنا دیا گیا ہے۔ گویا یہاں مرد ہی کے حقوق ہیں۔ عورت بے چاری تو محض باندی ہے۔ اسے ہر حال میں اپنے شوہر کو خوش رکھنا ہے اور اس کی اور اس کے گھر والوں کی خدمت کرنی ہے۔ حقوق کے بغیر فرائض کی ادائیگی کا یہ تصور بالکل غیر اسلامی ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ عورتوں کے بھی اسی طرح حقوق ہیں جس طرح ان کے فرائض ہیں۔ حق مہر ان حقوق میں سے ایک اہم حق ہے۔

شوہر کے انتخاب کا اختیار اور حق خلع: اسلام کے مطابق نکاح کے دو جزو ہیں۔ ایک، عورت کے درمیان ایجاب و قبول۔ دوسرے، گواہوں کی موجودگی۔ ارکان نکاح کے ان دونوں اجزا پر غور کریں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عورت اور مرد کے درمیان ایک معاہدہ ہے جس میں ولی کی رضامندی شرط ہے۔ لیکن ولی کو اس بات کی ہرگز اجازت نہیں ہے کہ وہ عورت کو اس کی مرضی کے خلاف جس کے ساتھ چاہے رشتہ نکاح میں باندھ دے۔ صرف باپ کو اپنی نابالغ لڑکی کا نکاح کرنے کی اجازت ہے۔ تاہم اگر لڑکی کو وہ نکاح ناپسند ہو تو وہ اس نکاح کو منسوخ کرا سکتی ہے۔

ہمارے معاشرے کی صورت حال اس تعلیم کے بالکل خلاف ہے۔ یہاں ایجاب و قبول رسماً تو لڑکے اور لڑکی کے درمیان ہی ہوتا ہے مگر اصلاً وہ لڑکی کے ولی اور لڑکے کے درمیان ہوتا ہے۔ لڑکی سے محض

خانہ پری کے لیے بہ وقت نکاح رضامندی طلب کی جاتی ہے۔ بعض اوقات لڑکی کے خاندان والے اس پر اپنی مرضی مسلط کر دیتے ہیں۔ وہ دھونس، دھاندلی یا ترغیب و ترہیب سمیت تمام ذرائع کو کام میں لاکر لڑکی کو اپنی مرضی کے فرد سے نکاح کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ وہ اس کا کوئی خیال نہیں کرتے کہ جس معصوم نے ایک غیر مرد کے ساتھ زندگی کا طویل سفر طے کرنا ہے، خود اس کی رائے اس کٹھن سفر اور اپنے ہم سفر کے بارے میں کیا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ ہم لڑکی کو جس شخص کے ساتھ ساری زندگی کے سفر پر روانہ کر رہے ہیں، آیا وہ خود بھی اس شخص کے ساتھ دو قدم چلنے پر آمادہ ہے۔ ہمارے معاشرے کی عورت اس ظلم اور حق تلفی کا شکار ہے اور پھر بھی ہمیں یہ غلط فہمی ہے کہ ہم عورت کے باب میں اسلام کی سنہری تعلیمات پر عمل پیرا ہیں۔

حجاب: جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، اسلام کے نزدیک عورت ایک مکمل انسان ہے کہ وہ نوع کے اعتبار سے برابر مگر جنس کے اعتبار سے مختلف ہے۔ حجاب عورت کا حق بھی ہے اور فرض بھی۔ حق اس طرح کہ کسی معاشرے یا فرد کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ عورت کو بے حجاب ہونے پر مجبور کرے، اور فرض اس طرح کہ عورت اپنے جسم کی نمایش نہ کرتی پھرے۔ اپنی حفاظت کرنا اور اپنے آپ کو حجاب میں رکھنا عورت کے لیے باعث عزت و شرف ہے۔ پردہ شرافت کی علامت ہے۔ یہ معاشرے میں عورت کے بھرپور کردار کی راہ میں ذرا بھی رکاوٹ نہیں ہے اور نہ ہی کسی کو پردے کو اپنے تعمیری کردار کی راہ میں رکاوٹ سمجھنا چاہیے اور نہ رکاوٹ بننے دینا چاہیے۔ حالات کی تبدیلی سے اب عورت کو پہلے سے زیادہ عملی کردار ادا کرنے کے مواقع مل رہے ہیں۔ لہٰذا مسلم عورت کو اپنی سیرت و کردار سے یہ بات ثابت کرنا چاہیے کہ اسلام کے احکام اس کے بھرپور کردار میں معاون ہیں، رکاوٹ نہیں۔

ہمارے معاشرے میں پردے کی عملی شکلیں بھی متعدد ہیں۔ عام طور پر خواتین ان احکام کا خیال رکھتی ہیں اور پابندی کی کوشش کرتی ہیں۔ ایک قلیل سا طبقہ ہے جس کی عورتیں بے حجابانہ گھومتی ہیں یا پھر شوبزنس سے تعلق رکھنے والی اداکارائیں اسلامی احکام حجاب کی سخت خلاف ورزی کی مرتکب ہوتی ہیں جو معاشرے میں اخلاقی بے راہ روی پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔

یہ اس مقام بلند کی چند جھلکیاں ہیں جو اسلام نے عورت کو دیا ہے مگر دور زوال میں مسلم معاشرے میں عورت کو اس مقام سے نیچے گرا دیا گیا ہے۔ اب اونچائی پر کھڑا ہوا مرد، عورت کو یقین دلائے چلا جا رہا ہے کہ تیرا اصلی مقام یہی ہے جہاں تو اب ہے۔ عورت کے اندر کی روح جو مرد کی روح کی طرح بلندیوں کی طرف مائل بہ پرواز ہونے کو بے قرار ہے، بلندی کی طرف اٹھنا چاہتی ہے مگر وہ اپنے لیے پرواز کے راستے بند یا محدود پاتی ہے۔

اب ہمارے سامنے یہ سوال ہے کہ عورت معاشرے میں اپنا حقیقی مقام کیسے حاصل کرے؟

اس مقام کے حصول کے لیے سب سے بڑی ضرورت اسلامی تعلیمات کے گہرے شعور کی ہے۔ حصول حقوق کی کش مکش شاید اتنی ہی قدیم ہے جتنی یہ دنیا۔ انسان کی سرشت میں عدل کے ساتھ ساتھ حق تلفی کا عنصر بھی موجود ہے۔ وہ عدل تو اپنے لیے چاہتا ہے مگر حق تلفی دوسروں کی کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ہر دور میں طاقت ور افراد یا اقوام اس ضابطے پر عمل کرتے ہوئے کمزوروں کو دباتے رہتے ہیں۔ معاشرے کا ہر طاقت ور اپنے سے کمزور کے کندھے پر سوار ہو کر اپنا قد بڑھاتا ہے اور معاشرے کے ہر کمزور کو اپنے بوجھ کے ساتھ ساتھ اپنے سے اوپر والوں کے بوجھ کو بھی اپنے کندھوں پر سہارنا پڑتا ہے۔ نتیجتاً ظلم و ناانصافی پر مبنی معاشروں میں سب سے زیادہ بوجھ اس کے سب سے کمزور طبقات پر آن پڑتا ہے۔ جسمانی ساخت کے اعتبار سے چونکہ عورت معاشرے کی کمزور ترین فرد ہے لہٰذا عورت پر سب سے زیادہ بوجھ پڑتا ہے اور وہ مظلوم ترین ہوتی ہے۔ مگر یہ بھی قانون قدرت ہے کہ اس کائنات میں ظلم کو قرار حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا مظلوم اپنے حقوق کی خاطر اٹھتے ہیں مگر کامیابی کے بعد دوسری انتہا کی طرف لڑھک جاتے ہیں۔ اس طرح انسانی معاشروں کا افراط و تفریط کا شکار ہو کر کبھی ادھر اور کبھی ادھر چلنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ انسانی جدوجہد میں نقطۂ اعتدال اس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک اس میں "اللہ" کو داخل نہ کیا جائے۔ جب انسانی جدوجہد تعلیمات خداوندی کے مطابق ہو تو انسانیت کا سفر خالصتاً صراط مستقیم پر ہو گا۔ چنانچہ عورت کے حقوق کی سعی بھی اسلام کے صراط مستقیم پر چلتے ہوئے ہی منزل مقصود سے ہم کنار ہو سکتی ہے۔

عورت کے حقوق کی جدوجہد معاشرے کے ان طبقوں کو منفی طور پر متاثر کرے گی جن کے مفادات عورت کی موجودہ پستیوں کا ثمر ہیں۔ بعض لوگوں کی سوچ جامد ہو جاتی ہے وہ کسی بھی قسم کی تبدیلی کو ذہنی طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ بعض کے خود ساختہ اعتقادات انھیں عورت کے نئے مقام کے بارے میں متوحش کر دیتے ہیں۔ اس صورت حال میں' عورت کو اپنے مقام کے حصول کے لیے اپنوں ہی کی طرف سے مخالفتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لہٰذا آج کی عورت کو اپنا حقیقی مقام پانے کے لیے حالات کا مقابلہ کرنے کا عزم صمیم لے کر نکلنا ہو گا۔

اب ہم مختصر طور پر اس مشکل راستے کے لیے زاد راہ کی نشان دہی کریں گے جسے ساتھ لے کر عورت کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے میں آسانی رہے گی۔ سب سے پہلی بات اسلام کا فہم ہے تاکہ اسے معلوم ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کی تعلیم میں اس کا حقیقی مقام کیا ہے' اور اسے کن حقوق سے بہرہ ور کیا گیا ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ اس مضمون میں بیان کردہ عورت کے حقوق کسی فرد یا ادارے کے عطا کردہ نہیں بلکہ خالق کائنات کے مقرر کردہ ہیں۔ اللہ کا عطا کردہ مقام اور اللہ کے مقرر کیے ہوئے عورت کے

حقوق، اس کے لیے اللہ کی عنایت اور رحمت ہیں۔ ان میں تبدیلی یا ان میں سے بعض سے عورت کو محروم کرنا، کسی ادارے، حکومت، طبقے یا قوم کے لیے قطعاً جائز نہیں ہے۔ ان حقوق پر غاصبانہ قبضہ کر کے عورت کو ان سے محروم کرنا حرام ہے۔ فعل حرام کے مرتکبین کا راہ راست اختیار کرنا مذہباً، قانوناً اور اخلاقاً ہر لحاظ سے لازم ہے۔ چنانچہ عورت اسلامی تعلیمات کی تفصیلات سے مسلح ہو کر، اور قرآن و حدیث سے گہری واقفیت حاصل کر کے اپنے مقام کے تحفظ اور اپنے حقوق کے حصول کی جنگ بہتر طور پر لڑ بھی سکتی ہے اور جیت بھی سکتی ہے۔

اسلامی علوم کی گہری واقفیت کے بعد اس جدوجہد میں شریک خواتین کا دوسرا وصف اعلیٰ سیرت و کردار کا حامل ہے۔ وہ سراپا اخلاق ہوں۔ وہ ایثار کا پیکر ہوں۔ ان کی سوچ اصولی اور عمل میں حسن ہو۔ وہ پاکیزہ خیالات اور پاکیزہ اوصاف سے متصف ہوں تاکہ کوئی بھی ان پر حرف گیری نہ کر سکے۔

تیسری بات یہ کہ عورت کو علم ہونا چاہیے کہ تبدیلی کا یہ عمل طویل عرصے پر محیط ہوتا ہے۔ اس کے لیے استقامت چاہیے، اپنے نظریات کی صداقت پر یقین چاہیے، اور جہد مسلسل کا عزم چاہیے۔ مایوسی اس راستے کا ایسا بھاری پتھر ہے جس کو چوم کر بڑے بڑے اپنا راستہ بدل دیتے ہیں۔ اس پتھر کو راستے سے عزم راسخ کے ذریعے ہٹایا جا سکتا ہے۔ اس طویل جدوجہد میں ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ، نسلوں کے ذہن بدلنے کی ضرورت ہے جس کا آغاز گھر سے ہوتا ہے اور معاشرے تک وسیع ہو جاتا ہے۔

عورت اپنی جدوجہد کے ذریعے اپنا حقیقی مقام نہیں پا سکتی جب تک ایک صحیح اسلامی معاشرہ وجود میں نہیں آتا۔ صحیح اسلامی معاشرہ صحیح الفکر اسلامی قیادت اور بہت بڑی تعداد میں اسلامی کردار کے حامل عوام کے ذریعے ہی قائم ہو سکتا ہے۔ قیادت کی یہ خوبی ہونا چاہیے کہ اسلامی نظام عدل کا قیام ان کے لیے زبان کے شغل کے بجائے، ایمان کا مسئلہ ہو۔

آج کی عورت کو عورتوں میں ان کے حقوق کا شعور پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ایسی نسل تیار کرنے پر بھی بھرپور توجہ دینا چاہیے جو اسلام کو اپنے مقصد حیات کے طور پر قبول کرے اور اسلامی نظام عدل کے قیام کو اپنی زندگی کا واحد مقصد ٹھہرائے۔ اس اہم خدمت کو سرانجام دینے سے ان کی غرض اللہ کی رضا کے حصول اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

تحریک اسلامی اور اس کے عالمی اثرات

عبدالرشید صدیقی ○

(دوسری اور آخری قسط)

۴۔ مغرب میں تحریک اسلامی کے اثرات

(الف) سیاسی اثرات: جہاد افغانستان، انقلاب ایران، الجزائر میں اسلامک سالویشن فرنٹ کی الیکشن میں کامیابی، سوڈان میں اسلامی حکومت کا قیام اور فلسطین میں حماس کی انتفادہ تحریک، وہ نمایاں نشان راہ ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پچھلے ۲۰ برس میں اسلام سیاسی طور پر تمام ہی ممالک میں اثرانداز ہوا ہے۔ ایرانی انقلاب سے ایک نیا ماڈل سامنے آیا کہ کس طرح عوام کو منظم کیا جا سکتا ہے اور کس طرح معاشرے کے مختلف طبقات کو مجتمع کیا جا سکتا ہے۔ باوجود شیعہ سنی فقہی اختلاف اور عرب اور فارس کی باہمی رقابت کے، اس انقلاب کا اثر تمام مسلم دنیا میں محسوس کیا گیا۔ انقلاب ایران کے بعد تحریکات اسلامی کے قائدین امام خمینی سے ملاقات کے لیے ایران گئے۔ ایران میں وہاں کی اہم شاہراہوں کے نام خالد اسلامبول، سید قطب" اور شیخ کشک" کے نام پر تبدیل کیے گئے۔ اسی طرح جہاد افغانستان میں روس کے خلاف مجاہدین نہ صرف پاکستان بلکہ اکثر عرب ممالک اور دیگر مسلم ممالک سے شریک ہوئے۔ انھوں نے امت مسلمہ کی یک جہتی کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ افسوس یہ ہے کہ آپس کی خانہ جنگی نے اس جہاد سے حاصل فتح کو انتشار میں تبدیل کر دیا ہے۔ الجزائر میں اسلامک فرنٹ کی کامیابی سے یہ واضح ہوا کہ اگر عوام کو ان کی رائے کے اظہار کا آزادانہ موقع ملے تو وہ اسلام کے حق میں ووٹ ڈالیں گے لیکن مغربی استعمار یہ نہیں چاہتا کہ کسی ملک میں بھی اسلامی حکومت قائم ہو سکے۔

سوڈان میں اسلامی حکومت کا ایک نیا تجربہ ہوا۔ وہاں جنرل حسن البشیر کی فوجی قیادت اور ڈاکٹر حسن ترابی کی فکری رہنمائی میں اسلامی حکومت قائم ہوئی۔ حال ہی میں، مغرب کی مسلسل مخالفت اور مداخلت

○ ریسرچ اسکالر، اسلامک فاؤنڈیشن، لسٹر، برطانیہ

اور خاص طور سے جنوبی سوڈان میں عیسائی اقلیت کی مزاحمت اور خانہ جنگی کے باوجود اسلامی دستور کو عوام نے بھاری اکثریت سے منظور کیا۔ اس میں اقلیتوں کے حقوق کو تحفظ دیا گیا ہے۔ گذشتہ ۱۰ برسوں میں مغرب کی سازشوں اور بعض مسلم ممالک کی ریشہ دوانیوں کے باوجود سوڈان نے خاطر خواہ ترقی کی ہے۔

اگست ۱۹۹۰ میں کویت پر عراقی قبضے کے بعد اسلامی تحریکات نے پہلی مرتبہ اسلامی سفارتی کوشش سے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی۔ عمان میں ۱۲ تا ۱۵ ستمبر ۱۹۹۰ ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اس مسئلے پر غور و فکر کے بعد اسے اسلامی تناظر میں حل کرنے کی کوشش کا آغاز ہوا۔ اس کانفرنس میں مصر، اردن اور شام کے اخوانی رہنما، سوڈان کے نیشنل فرنٹ، تیونس کی النہضہ، پاکستان کی جماعت اسلامی، ملایشیا کی اسلامک پارٹی، مصر کی لیبر پارٹی، فلسطین سے حماس کے نمایندے اور الجزائر سے الارشاد والاصلاح کے رہنما اور اس کے علاوہ عالم اسلام کی ممتاز شخصیتوں نے شرکت کی۔ تمام شرکا کی یہ خواہش رہی کہ کسی طرح جنگ کے امکانات کو ختم کیا جائے، مسلم ممالک سے مغربی فوجوں کا انخلا عمل میں لایا جائے، عراق کی ناکہ بندی ختم ہو اور کویت کے لوگ آزادی سے اپنے ملک میں رہ سکیں۔ اس طرح ایک اسلامی تناظر میں اس مسئلے کو حل کیا جائے۔ ان تجاویز کو قابل عمل بنانے کے لیے ایک وفد بنایا گیا جس نے اردن کے شاہ حسین، سعودی عرب کے شاہ فہد، عراق کے صدام حسین اور ایران کے صدر رفسنجانی سے ملاقاتیں کیں۔ یہ تمام کوششیں سودمند ثابت نہ ہوئیں تاہم اس وفد نے ایک قابل عمل منصوبہ پیش کیا۔

(ب) معاشی اثرات: اسلامی تحریک کے مفکرین نے اسلامی معاشیات پر علمی اور تحقیقی کاموں کا آغاز کر کے اس بات کی کوشش کی کہ کسی طرح مغربی سرمایہ دارانہ اور اشتراکی معاشی نظریات کے بجائے خالص اسلامی نقطۂ نظر سے مسلمان ملک اپنا معاشی نظام چلا سکیں۔ اس سلسلے میں پہلی کوشش اسلامی بنکوں کا قیام تھی تاکہ مسلم ممالک اور ان کے عوام سود کی لعنت سے نجات پا سکیں، اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بازار اور منڈی میں لین دین اور تجارت کو ممکن بنایا جا سکے۔ اس اسلامی معاشی فکر کے نتیجے ہی میں اکثر ممالک میں ایسے بنک اور تجارتی ادارے قائم ہوئے ہیں جن میں بلاسود کاروبار کا اہتمام کیا گیا ہے، اور وہ مسلمان جو سودی کاروبار سے بچنا چاہتے ہیں ان کے لیے سرمایہ کاری کی راہ نکالی گئی ہے۔ خود مغرب میں کئی ایسے ادارے قائم ہوئے جن میں "دارالمال اسلامی" اور "البرکہ بنک" مشہور ہیں۔ ۱۹۷۵ میں اسلامی ترقیاتی بنک قائم ہوا۔ اس کے فنڈ سے مختلف مسلم ممالک میں ترقیاتی منصوبوں میں سرمایہ لگایا گیا۔

بین الاقوامی تعاون کے علاوہ علاقائی تعاون کے کئی ادارے وجود میں آئے جن میں اکثر اپنی علاقائی اور جغرافیائی معاشی (geo-economic) خوش حالی کے لیے قائم ہوئے۔ البتہ اسلامی ممالک کی معاشی تعاون کی تنظیم (ECO) کے پیش نظر اسلامی برادری کا فروغ ہے۔ اس میں ترکی بھی شامل ہے۔

مغرب کو اس بات کا احساس ہے کہ اگر عالم اسلام کے وسائل اسلام پسندوں کے ہاتھ آ جائیں تو وہ

مغرب کو تیل اور دیگر تمام پیداوار سے محروم کر دیں گے اور یہ مغرب کی معاشی تباہی کے مترادف ہو گا۔ چنانچہ تحریک اسلامی کی مخالفت کا اصل سبب یہی خدشہ ہے۔

(ج) **تہذیبی اثرات ' مغرب اور اسلام کا تہذیبی تصادم :** مخالفتوں اور مزاحمتوں کے باوجود اسلامی تحریک کی پیش رفت مغرب کے لیے باعث تشویش ہے۔ مغرب میں اسلام سے بلاوجہ خوف زدگی (Islamo Phobia) کا تاثر عام ہے کیونکہ تحریک اسلامی نے مغربی تہذیب کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور مغربی تہذیب کے بجائے اسلامی تہذیب کے احیا کے لیے جدوجہد کر رہی ہے' اس لیے یہ خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ ان دونوں تہذیبوں کے مابین تصادم ناگزیر ہے۔ یہ خطرہ اب اور بھی زیادہ شدت اختیار کر گیا ہے کیونکہ کیمونزم کے خاتمے کے بعد سوائے اسلام کے کوئی اور نظریۂ حیات مغربی تہذیب کے مدمقابل نہیں رہا ہے۔ اس خطرے کو علمی سند ہارورڈ کے پروفیسر سیمیول ہنٹنگٹن کے اس اہم مضمون سے حاصل ہوئی جو امریکہ کے بااثر رسالے فارن افیئرز میں ۱۹۹۳ میں شائع ہوا تھا۔ مضمون کا عنوان Clash of Civilizations: The Next Pattern of Conflict تھا۔ ہنٹنگٹن نے پیش گوئی کی کہ قوموں کے مابین تصادم موجودہ دنیا میں مقابلے کی آخری ارتقائی منزل ہے۔ چنانچہ آیندہ تصادم تہذیبوں کے درمیان ہو گا اور اب کیمونزم کے خاتمے کے بعد ہماری اصل حریف اسلامی طاقتیں ہیں۔

اسلام کا مقابلہ کس طرح کیا جائے؟ اس بارے میں مغرب کے اہل علم کے درمیان دو نظریے پائے جاتے ہیں۔ جو لوگ تہذیبی تصادم کے خطرے کو محسوس کر رہے ہیں ان کی رائے یہ ہے کہ اسلام کو ہر ممکن طریقے سے دبایا جائے اور اس کو آگے بڑھنے اور قوت حاصل کرنے سے محروم رکھا جائے۔ اس کے برعکس بعض مفکرین کی رائے یہ ہے کہ اسلام کو طاقت کے بل پر دبانا مشکل اور مہنگا نسخہ ہے۔ اگر اس کو اسی طرح چھوڑ دیا جائے تو وہ خود موجودہ دور کے مشکل مسائل اور پیچیدہ معاشی حالات کو اسلامی طریقے سے حل نہ کر سکے گا' لہٰذا قدرتی طور پر ناکام ہو جائے گا۔

مغربی مفکرین کا ایک اور خدشہ یہ بھی ہے کہ اگرچہ بعض ممالک میں تحریک نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے جمہوری طریقہ اختیار کیا ہے لیکن اگر ایک مرتبہ اسلامی نظام قائم ہو گیا تو پھر مغربی اقدار اور جمہوریت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ چنانچہ الجزائر میں جب یہ محسوس ہوا کہ اسلامک فرنٹ انتخابات میں کامیاب ہو جائے گا اور حکومت پر قابض ہو جائے گا تو مغربی طاقتوں کے دباؤ پر فوج نے اس امکان کو ختم کر دیا۔

اسلام مغربی تہذیب کے لیے خطرہ ہے' اس کا اظہار متعدد کتابوں' اخبارات و رسائل میں مسلسل کیا جا رہا ہے۔ سنڈے ٹائمز نے ایک اداریے میں لکھا ہے: ہرماہ وارسا پیکٹ کی طرف سے خطرے میں کمی ہو رہی ہے لیکن بنیاد پرست اسلام کی جانب سے خطرے میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ خدشہ اگرچہ سرد جنگ سے مختلف ہے لیکن مغرب کو اسے دبائے رکھنا ہے' اسی طرح جس طرح کیمونزم کو دبائے رکھا گیا۔

ایک مشہور صحافی پیٹر جنکنز لکھتے ہیں: اسلام کو پرے رکھنا ۱۳۵۴ سے یورپ کی حکمت عملی رہی ہے

... اب ایرانی انقلاب کے بعد اس حکمت عملی پر دوبارہ عمل پیرا ہونا چاہیے۔

یورپ اور امریکہ میں اب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہو چکی ہے۔ یہاں کی مسلم آبادی میں اسلامی تحریک کے نفوذ سے مغرب کے تمام ہی ممالک میں خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے۔ خاص طور سے فرانس' جرمنی اور برطانیہ میں جہاں کے بڑے صنعتی شہروں میں خاصی تعداد میں مسلمان آباد ہیں۔ مسلمانوں کی شرح پیدائش مقامی آبادی کی بہ نسبت زیادہ ہے اور مسلمان دوسری اقلیتوں کی طرح مقامی تہذیب میں ضم ہونا نہیں چاہتے' اس لیے وہاں یہ خطرہ زیادہ محسوس کیا جا رہا ہے۔ وہ مسلمانوں سے تہذیبی تصادم کا خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ ایک برطانوی مصنف چارلس مور کی پیش گوئی ہے:

> برطانیہ اصلاً انگریزی بولنے والے عیسائی اور سفید فام لوگوں کا ملک ہے۔ اگر ہم یہ سوچنا شروع کر دیں کہ یہ اصلاً اردو بولنے والے مسلمان اور گندمی رنگ کے لوگوں کا مسکن ہے' تو یہ خوفزدہ کرتا ہے اور غصہ دلاتا ہے ○

۵۔ مغرب کا ردعمل

یہ بات واضح ہے کہ مغرب نہایت شدت سے اسلام کو اپنی تہذیب اور ثقافت کے لیے خطرہ سمجھتا ہے۔ مغربی مفکرین اس بات پر متفق نہیں ہو سکے کہ وہ اس "خطرے" کا مقابلہ کس طرح کریں۔ چنانچہ مختلف حکمت عملیاں استعمال کی جا رہی ہیں۔ ان کا جائزہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:

(الف) **خطرے کا الارم**: اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے لے کر عوام الناس تک کے ذہنوں پر اسلام سے ایک غیر معمولی خوف کا ہوا سوار ہے۔ درجنوں کتابیں' ٹی وی پروگرام' اخبارات و رسائل اسلام دشمنی پر مبنی ہیں۔ بعض کتابوں' مضامین اور پروگراموں کے عنوانات سے اس خوف و دہشت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے: The Rage of Islam (اسلام کا غصہ)' The Dagger of Islam (اسلام کا خنجر)' Allah in the West (اللہ مغرب میں)' The Militant Islam (جنگ جو اسلام)' Islamic Threat (اسلامی خطرہ)' The Green Threat (سبز خطرہ)' The Sense of Siege (محاصرے کا احساس)' The Muslims are Coming, The Muslims are Coming! (مسلمان آ رہے ہیں' مسلمان آ رہے ہیں!)' Islam on the Road again After Seven Centuries (سات صدیوں بعد اسلام پھر آگے بڑھ رہا ہے)' The Holy Warriers in the Path of God (مجاہدین راہ خدا میں)۔

○ یہ تمام اقتباسات درج ذیل کتب سے لیے گئے ہیں:

The Rise of Islamist Movements and the Western Response: Clash of Civilizations and Clash of Interests. The Islamist Dilemma: The Political Role of Islamist Movements in the Contemporary Arab World.

اس بے پناہ پروپیگنڈے کا مقصد رائے عامہ کو اسلام کے خلاف منظم کرنا ہے۔ اس لیے کہ اس طرح اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے بعد اگر حکومت ان کے خلاف کوئی کارروائی کرے گی تو عوام میں ان کے حق میں کوئی آواز اٹھانے والا نہ ہوگا۔ یہ وہی پالیسی ہے کہ کتے کو برا نام دے کر مار ڈالو۔

جہاں سیاسی محاذ پر اسلام کو روکنے کی کوششیں ہو رہی ہیں' وہاں علمی محاذ پر بھی اسلام اور اس کی تعلیمات' اہل علم کی تنقید بلکہ تنقیص کا ہدف ہیں۔ اکثر کتابوں اور مضامین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر نکتہ چینی ہے۔ مخالفین کا خاص ہدف قرآن کریم کا من جانب اللہ ہونا' اسلام میں عورتوں کے حقوق کی پامالی' انسان کے بنیادی حقوق کی حق تلفی' جمہوریت اور آزادی پر پابندی ہے۔

ان تمام حربوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مغرب میں لوگ اچھی خاصی تعداد میں مسلمان ہو رہے ہیں۔ ان میں اکثریت غیر مسلم خواتین کی ہے۔

(ب) تحریک اسلامی کو بدنام کرنا: مغرب کو اصل خطرہ مسلم عوام سے نہیں ہے بلکہ ان کا سارا نزلہ تحریک سے متعلق افراد پر گرتا ہے۔ اسلام دشمنی کا ایک اثر خود مغرب کے مفاد پر بھی پڑتا ہے اور مسلم ممالک میں مغرب کے خلاف جذبات بھڑک جاتے ہیں۔ اس لیے اب اس نے اصل ہدف تحریک اسلامی کو بنایا ہے۔ اس سلسلے میں چالاکی سے تحریک سے متاثر مسلمانوں اور دیگر مسلمانوں میں تفریق کی گئی ہے۔ ان کو ممیز کرنے کے لیے "بنیاد پرست" کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ اگرچہ اصلاً اس اصطلاح کا اطلاق ان پروٹسٹنٹ عیسائیوں پر ہوتا تھا جو بائبل کو بعینہٖ کلام خداوندی قرار دیتے تھے۔ انھوں نے یہ اصطلاح اس لیے اختیار کی تاکہ وہ یہ کہہ سکیں کہ وہ اسلام کے بطور مذہب مخالف نہیں ہیں۔ اس طرح انھیں مسلم ممالک کے ان حکمرانوں کی ہمدردیاں بھی حاصل ہوئیں جو تحریک کے مخالف ہیں۔

مسلمانوں میں مزید تفریق پیدا کرنے کے لیے اب بنیاد پرستی کے ساتھ ایک اور فنی اصطلاح بھی رائج کی جا رہی ہے اور وہ "عوامی اسلام" (Popular Islam, Folk Islam) ہے۔ مسلمانوں میں جو مختلف بدعات اور من گھڑت رسوم رائج ہو گئی ہیں' انھیں اصل اسلام قرار دیا جا رہا ہے۔ مغربی مفکرین کی رائے یہ ہے کہ عوام کی اکثریت اس اسلام کی پیروی کر رہی ہے اور یہ اسلام ان کے لیے خطرے کا باعث نہیں ہے بلکہ یہ عیسائیت سے زیادہ قریب ہے۔ بل مسک نے اپنی کتاب The Unseen Face of Islam: Staring the Gospel with ordinary Muslims میں مختلف مسائل میں Official Islam یعنی "مستند اسلام" اور عوامی اسلام میں موزانہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح "عوامی اسلام" عیسائیت سے قریب تر ہے اور اس کے ذریعے عیسائیت کی تبلیغ کی جا سکتی ہے۔

(ج) باہمی مفاہمت اور بین المذاہب مکالمات: جہاں تصادم اور تنازع کا ہر وقت خدشہ ظاہر کیا جاتا ہے وہاں اس کے برعکس ایک کوشش اسلام کو سمجھنے اور اس سے مصالحت کی بھی ہو رہی ہے جسے "پل

بنانا" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اکثر شہروں میں بین المذاہب مکالمے کونسل یا اس نوعیت کی دیگر تنظیمیں قائم ہیں جن کا مقصد آپس میں مل کر مختلف مسائل پر اسلام اور عیسائیت کی تعلیمات کا موازنہ کرنا ہے۔ اس میں پیش پیش چرچ کے ادارے ہیں۔ برطانیہ میں قومی سطح پر Inter-faith Network قائم ہے۔ اس طرح کے ادارے دیگر مغربی ممالک میں بھی موجود ہیں۔ اس طرح تصادم کے بجائے مصالحت کی راہ اختیار کرنے کی کوشش بھی جاری ہے۔ چرچ سے ہٹ کر مختلف علمی اور نیم سیاسی ادارے بھی اس کوشش میں ہیں کہ باہمی مکالمے سے ایک دوسرے کے خیالات سے آگاہی حاصل ہو۔ پچھلے چند برسوں میں جو اہم اقدامات ہوئے ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

○ ایک امریکی تحقیقی ادارہ، عالمی اسلامی تعلیمات کا مطالعاتی ادارہ (WISE) ہے، اس کا مقصد مسلمانوں کے سیاسی، معاشی اور تاریخی مسائل پر تحقیق کرنا ہے۔ اس نے تبادلۂ خیال کی ایک نشست، مئی ۱۹۹۴ میں منعقد کی جس میں احیائے اسلام کے چیلنج، منزل اور مستقبل کے تناظر میں پروفیسر خورشید احمد سے تفصیلی گفتگو کی گئی۔ اس کارروائی کو پروفیسر ابراہیم ابو ربیع نے مرتب کر کے شائع کیا۔ کتاب کا نام ہے:

Islamic Resurgence: Challenges, Directions and Future Perspectives.

○ اسی طرح پچھلے سال فروری میں ولٹن پارک کانفرنس میں تحریک اسلامی کے رہنما قاضی حسین احمد کو برطانیہ میں مدعو کیا گیا۔ اس پانچ روزہ کانفرنس کا عنوان "اسلام اور مغرب کے درمیان مصالحاتی تعلقات" تھا۔ یہ کانفرنس دسمبر ۱۹۹۶ میں اسی موضوع پر ہونے والی کانفرنس کا تتمہ تھی۔ اس کانفرنس میں پرنس چارلس، برطانیہ میں مسلم ممالک کے سفارتی عملے کے افسران، نیز خود برطانوی حکومت کے نمایندے اور مسلم اور غیر مسلم دانشور شامل تھے۔ کانفرنس کے اختتامی اعلامیے میں اور باتوں کے علاوہ یہ بات بھی درج ہے: "چونکہ ہم اس زمین کے مشترک شہری ہیں، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہم مختلف ثقافتوں، قوموں اور مذاہب کے درمیان پل بنائیں"۔

○ ولٹن پارک ایک علمی ادارہ ہے جو برطانوی وزارت خارجہ نے قائم کیا ہے اور اس کے تحت منعقدہ کانفرنسوں کی کارروائیاں برطانوی حکومت کے سرکاری چھاپے خانے سے چھاپی جاتی ہیں۔ اس سال اپریل میں ایک کانفرنس جرمن کے صدر رومن ہرزوگ نے اپنی سرکاری رہائش گاہ بیلے ویو کاسل میں منعقد کی۔ اسے "بین الاقوامی کانفرنس برائے ثقافتی مکالمات، مغربی اور اسلامی معاشروں کے مابین مستقبل کے تعلقات" کا نام دیا گیا۔ برلن کی اس کانفرنس میں جرمنی کی حکومت کے عہدے داران کے علاوہ الجزائر، مصر، فن لینڈ، انڈونیشیا، اٹلی، ملایشیا، فرانس، ناروے اور اسپین کی حکومتوں کے نمایندے بھی شامل تھے۔ اس دو روزہ کانفرنس کا مقصد "مغرب اور اسلام کے مابین مستقبل میں ہونے والے تصادم کو روکنا اور ختم کرنا" قرار پایا۔ اس موقع پر صدر ہرزوگ نے اپنی کتاب کی رونمائی بھی کی۔ کتاب کا نام Preventing the clash of civilizations: a peace strategy for the 21st Century (تہذیبی تصادم کو روکنا:

اکیسویں صدی کے لیے امن کی حکمت عملی) ہے۔ کانفرنس کے اختتام پر "میثاق برلن: مستقبل کے کام کا ایجنڈا" تیار کیا گیا اور تمام شرکاے کانفرنس نے اس پر اپنے دستخط ثبت کیے۔

○ اس سال اپریل میں ایک اور کانفرنس یورپ کی سبز پارٹی (Green Party in Europe) نے یورپین پارلیمنٹ برسلز، بلجیم میں منعقد کی۔ اس کا عنوان "اسلام یورپ میں" تھا۔ اس میں یورپ کے مختلف ممالک سے ۱۲۰ افراد نے شرکت کی۔ ڈاکٹر المین اس کے منتظم تھے۔ انھوں نے کانفرنس کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: یہ کانفرنس "اسلام مغرب میں" کے بارے میں ہے نہ کہ "اسلام اور مغرب"۔ اسلام کی مغرب میں موجودگی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ یورپ، بغیر اسلام کے 'یورپ نہیں ہے اور اسی طرح اسلام بھی موجودہ صورت میں بغیر یورپ کے نہیں ہے۔

○ برلن اور برسلز کے بعد اس سال اپریل کے آخر میں ایک اور کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی۔ اس کا اہتمام برٹش کونسل نے کیا، جو برطانوی وزارت خارجہ کا ثقافتی ادارہ ہے۔ اس میں برطانوی اور بیرونی ممالک سے مدعو اہل علم و اہل سیاست نے شرکت کی۔ کانفرنس کا موضوع "باہمی تعلقات: برطانیہ اور اسلام" تھا۔

اس طرح کی کانفرنسوں سے باہمی ملاقات اور تبادلۂ خیال کے مواقع فراہم ہو جاتے ہیں لیکن ان میں منظور کردہ قراردادوں اور میثاقوں کا اثر حکومتوں کی پالیسی اور ان کے فیصلوں پر کتنا پڑتا ہے، یہ ایک اہم سوال ہے۔ اس کا جواب آیندہ تاریخ ہی دے سکے گی۔

۶۔ ہماری ذمہ داری

(الف) اسلام اور مغرب کے دیرینہ روابط: اسلام کے بارے میں جو شکوک و شبہات اور غلط فہمیاں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر مغرب میں پائی جاتی ہیں اور ان کو ذرائع ابلاغ کے ذریعے پھیلایا جاتا ہے، اس کے پیچھے صدیوں کے تاریخی واقعات کا ایک سلسلہ موجود ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ اس تاریخی پس منظر میں اس کے مثبت پہلو کو اجاگر کریں۔ سب سے پہلے رابطے کی ابتدا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔ آپؐ نے سنہ ۷ ہجری (۶۲۸ عیسوی) میں مشرقی سلطنت روما کے بازنطینی فرماں روا ہرقل کے نام خط بھیجا جس میں آپؐ نے اسے اسلام سے روشناس کرایا اور قبول اسلام کی دعوت دی۔ اس خط میں اسلام کی بنیادی تعلیم یعنی توحید پر مجتمع ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ آج بھی اہل کتاب کے لیے ہماری دعوت یہی ہے۔ اس ضمن میں خصوصاً مغرب میں رہائش پذیر مسلمانوں کی اہم ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کے پیغام کو وہاں کے عوام تک پہنچائیں۔

(ب) اسلام مغرب کے لیے خطرہ نہیں: مغرب کو یہ باور کرانے کی ضرورت ہے کہ تحریک اسلامی کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنے ملکوں میں اسلام کے دیے ہوئے نظریۂ حیات کے مطابق اسلامی معاشرہ کی تشکیل کریں۔ اس طرح جب وہ فکری ہم آہنگی کے ساتھ ملک کی تعمیر میں لگ جائیں گے تو ملک ترقی کرے

گا۔ رہا اس بات کا خدشہ کہ مسلم ممالک فوجی طاقت کی بنا پر مغرب پر حملہ آور ہوں گے' تو یہ ایک خیال خام ہے۔ حقیقتاً مسلم ممالک اپنی معاشی اور فوجی قوت کے لیے مغربی طاقتوں پر انحصار کیے ہوئے ہیں۔ اگرچہ معاشی طور پر مسلم ممالک کے ذرائع و وسائل کافی ہیں لیکن یہ ایسا معاشی ہتھیار نہیں ہے جس سے مغرب کا مقابلہ ہو سکے۔ جہاں تک سائنس اور ٹکنالوجی کا معاملہ ہے مغرب کو اس میں کہیں زیادہ سبقت حاصل ہے' تو اسلام سے خطرہ محض ایک ہوا ہے جو لوگوں نے سروں پر سوار کر رکھا ہے۔ برطانیہ کے ایک آزاد ادارے نے دو سال کی تحقیق کے بعد اپنی رپورٹ 'Islamo Phobia: A Challenge for us all' ۱۹۹۷ میں شائع کی۔ جس میں یہ اعتراف کیا ہے کہ یہ خوف اور خدشہ بے بنیاد ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس سے باہمی تعلقات اور بین الاقوامی تعلقات زنگ آلود ہوں گے جس سے نسلی تعصب پیدا ہو گا۔

(ج) **باہمی مفاہمت کا پیغام**: دنیا کی طویل تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ جہاں ملکوں اور قوموں کے درمیان جنگیں' تصادم اور ٹکراؤ ہوئے وہاں وہ آپس میں ایک دوسرے کی تہذیب' ثقافت' خیالات اور اقدار سے بھی متاثر ہوئے۔ خود اسلام کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جنگجو تاتاروں نے خلافت عباسیہ کو ختم کر دیا مگر اسلام سے روشناس ہونے کے بعد وہی "کعبہ کے نگہبان" بن گئے۔ چنانچہ تہذیبی تصادم ناگزیر نہیں ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ باہمی مفاہمت کی فضا پیدا کی جائے تاکہ دنیا میں امن و امان قائم ہو۔ اسلام کی دعوت' بقائے باہمی کی دعوت ہے نہ کہ تصادم کی۔ قرآن کی رو سے بنی آدم کا اختلاف زبان' نسل اور رنگ فطری ہے اور اس کو اسی طرح باقی رہنا ہے۔ اسی طرح خیالات اور عقائد بھی مختلف ہوتے ہیں ورنہ اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک جیسا بنا دیتا۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (المائدہ ۵: ۴۸)--- اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا' اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اختلافات باقی رہیں گے اور ہمیں ان اختلافات کو برداشت کرتے ہوئے مل جل کر رہنا ہو گا۔

(د) **"اسلامی دہشت گردی" کے تاثر کا ازالہ**: مغرب کو اصل خطرہ "بنیاد پرست" مسلمانوں سے ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ شدت پسند ہیں لہٰذا دہشت گرد ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اہل مغرب پر واضح کیا جائے کہ اسلام دہشت گردی کے خلاف ہے۔ اسلام کسی بے گناہ کا خون بہانا جائز نہیں سمجھتا۔ ایک شخص کا ناحق قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔ قرآن کہتا ہے: کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو' یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے (المائدہ ۵: ۸)۔

مغرب کے صحافی اکثر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر اسلام دہشت گردی کے خلاف ہے تو مسلمان کھلم کھلا اس کی مخالفت میں آواز کیوں نہیں اٹھاتے۔ درحقیقت یہ ہمارا اسلامی فرض ہے کہ ہم ظلم و تشدد کے خلاف آواز بلند کریں۔ لیکن جب مسلمان یہ دیکھتے ہیں کہ مغربی طاقتیں اور اسرائیل مسلمانوں کو بے جا قتل کر رہے ہیں' الجزائر میں مغرب کے نمایندے مسلمانوں پر ظلم و ستم کر رہے ہیں۔ چیچنیا میں روس

مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے میں مصروف ہے اور اس کے مقابلے میں نہتے مسلمان جائز و ناجائز طریقے سے اس کا مقابلہ کر رہے ہیں' تو ظاہر ہے کہ ان کی ہمدردیاں مظلوم مسلمانوں کے ساتھ ہوں گی۔ محض اس بنا پر مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینا سراسر ظلم ہے' جب کہ مغرب اور اسرائیل اپنی سیاسی اور فوجی طاقت سے مسلمانوں کو ہر جگہ مغلوب کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

(ہ) مغرب کا دہرا معیار: جس طرح مغرب یہ چاہتا ہے کہ مسلم ممالک عدل و انصاف سے کام لیں' اسی طرح خود مغرب کا بھی فرض ہے کہ وہ بین الاقوامی معاملات عدل و انصاف سے طے کرے۔ اس وقت مغرب کے دو پیمانے ہیں: اگر کوئی اسرائیلی اور امریکی دہشت گردی کرتا ہے تو اس کے جواز میں کئی بہانے تراشے جاتے ہیں لیکن اگر یہی کام کوئی مسلمان کرے تو پوری قوم کو ملزم ٹھہرایا جاتا ہے۔ سلامتی کونسل میں متعدد قراردادیں اسرائیل کے خلاف پیش ہوئیں' امریکہ نے اپنا ویٹو کا حق استعمال کر کے ان کو مسترد کر دیا لیکن عراق پر بمباری کا جواز صرف ایک قرارداد کی بنا پر جائز قرار دے دیا۔ وہ لوگ جو کمزور اور بے بس ہیں ان کا معمولی جرم بھی قابل تعزیر ہوتا ہے لیکن وہ قزاق اور لٹیرے جو بے باکی سے تمام انسانی اقدار کو پامال کرتے ہیں' بلا کسی الزام کے دندناتے پھرتے ہیں۔ اس منافقت کو ختم ہونا چاہیے۔

ان معروضات کی روشنی میں ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہم کس طرح مغرب میں اسلام کی صحیح تعلیمات کو روشناس کرائیں۔ ان کو یہ باور کرانے کی ضرورت ہے کہ انسانیت کی بقا سب کے مل جل کر رہنے میں ہے۔ اگرچہ ہماری تاریخ میں صلیبی جنگیں اور سیاسی اور معاشی کش مکش موجود رہی ہے' اس کے باوجود انسانیت کی فلاح اسی میں ہے کہ ہم ایک دوسرے کے خیالات سے آگاہ ہوں۔ باہمی مکالمات اور افہام و تفہیم سے مسائل حل ہوں۔ تمام معاشی' سماجی' تعلیمی اور ثقافتی معاملات میں باہمی تعاون ہی سے ترقی ممکن ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے کو برباد کرنے پر تل جائیں اور انسانیت کو رنگ' نسل' قوم' زبان اور مذہب کی بنیاد پر تقسیم کر دیں' تو یہ سب ہماری بربادی کا سامان ہو گا۔ اسلام تمام دنیا کے لیے عدل و انصاف اور صلح و آشتی کا پیغام دیتا ہے۔ اسی طرح ہم بقائے باہمی پر نیا عالمی نظام (نیو ورلڈ آرڈر) برپا کر سکتے ہیں۔

حرف آخر: اس مختصر سے جائزے سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ پچھلے ۶۰ برس میں تحریک اسلامی نے مخالفتوں اور مزاحمتوں کے باوجود امت مسلمہ کے ایک بڑے طبقے کو متاثر کیا ہے۔ آج تحریک' دنیا کے تمام ہی ممالک میں سرگرم عمل ہے ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

تحریک نے مسلمانوں میں ایک نیا شعور اور نئی لگن پیدا کی ہے۔ ان میں جذبۂ دعوت و تبلیغ' جذبۂ قربانی و جہاد پیدا ہوا ہے۔ اب نئی صدی اور نیا عہد ہزار سال اسلام کے عروج اور ترقی کا عہد ہو گا' اور اگلا دور اسلام کے دور زریں کی یاد تازہ کر دے گا۔ ان شاء اللہ!

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

کی بینکنگ اور اسلامی معاشیات پر کتب

Elimination of Riba from the Economy
Prof. Khurshid Ahmad
pp 425 Rs. 300

Money and Banking in Islam (vol. I)
Dr. Zainuddin Ahmad
Dr. Munawwar Iqbal
Dr. Faheem Khan
pp 308 Rs. 250

Fiscal Policy & Resource Allocation in Islam (vol. II)
pp 396 Rs. 100

Islamic Banking: Conceptual Framework and Practical Options
Abdur Raheem Hamdi
pp 32 Rs. 120

Islamic Economics: Anoted Sources in English & Urdu
Muhammad Akram Khan
vol. I pp 224 $52
vol. II pp 250 $61

Economic Teachings of Prophet Muhammad: A Select Anthology of Hadith Literature on Economics
Muhammad Akram Khan
pp 368 Rs. 200

بنک کا سود: اسلامی اور شرعی نقطۂ نظر
ڈاکٹر محمد علی القری
صفحات = ۷۸ قیمت = ۴۰ روپے

ترقیاتی پالیسی کی اسلامی تشکیل:
مسلم دنیا کے لیے لائحہ عمل
پروفیسر خورشید احمد (ترجمہ محب الحق صاحبزادہ)
صفحات = ۱۵۷ قیمت = ۶۰ روپے

ربٰو اور بنک کا سود
ڈاکٹر یوسف قرضاوی
صفحات = ۱۲۰ قیمت = ۵۰ روپے

اسلامی بنکاری:
نظریاتی بنیادیں اور عملی تجربات
پروفیسر اوصاف احمد
صفحات = ۸۴ قیمت = ۳۵ روپے

جدید اقتصادی مسائل:
شریعت کی نظر میں
پروفیسر احمد محی الدین احمد، ڈاکٹر انور نعیمی
صفحات = ۷۰ قیمت = ۳۰ روپے

حرمت ربٰو اور غیر سودی مالیاتی نظام
ڈاکٹر محمود احمد غازی
صفحات = ۹۶ قیمت = ۳۵ روپے

تقسیم کنندہ:
بک ٹریڈرز
نصر چیمبرز، بلاک نمبر ۱۹، مرکز ایف سیون - اسلام آباد
فون نمبر: ۲۶۵۰۱۹۴ فیکس: ۲۶۵۰۷۰۳

دعوت دین --- عملی جہت

ڈاکٹر نذیر احمد شہیدؒ سے ایک انٹرویو

ڈاکٹر نذیر احمد شہیدؒ (شہادت: ۸ جون ۱۹۷۲) محتاج تعارف نہیں۔ آپ ایک مثالی کارکن اور قائد تھے۔ ان کی باتیں آج کے کارکنوں اور قارئین کے لیے راہ نما ہیں (مدیر)۔

سوال: ایک ایسے ضلع میں جو بڑے بڑے زمین داروں اور جاگیرداروں کا ضلع کہلاتا ہے' آپ جیسے قلیل الوسائل انسان کی کامیابی نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کی عوام میں مقبولیت کا کیا سبب ہے؟ آپ نے اپنی غربت کے باوجود انھیں کس طرح یقین دلایا کہ آپ ان کے حقوق کے لیے لڑ سکتے ہیں؟

جواب: ہر جگہ کے عوام اپنی ضروریات اور مسائل کے لیے مقامی قیادت کی طرف دیکھتے ہیں' اور وہ اس وقت تک قیادت تبدیل نہیں کرتے جب تک کوئی گروہ آگے بڑھ کر پہلے کے مقابلے میں بہتر طریق پر عوام کے مسائل کو سمجھ کر ان کو حل کرنے کی صلاحیت کا یقین نہ دلا دے' اور پھر عملاً یہ کام کر کے بھی نہ دکھا دے۔

اس وقت ہمارے دیہات میں' جو ملک کی آبادی کا اصل مرکز ہیں' مقامی قیادت زمین داروں کے ہاتھ میں ہے' جو محکمہ مال' محکمہ انہار اور محکمہ جنگلات وغیرہ کے تعاون سے عوام کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یہ چھوٹے یا بڑے زمین دار عوام کے مسائل کو حل کم کرتے ہیں' الجھاتے زیادہ ہیں۔ بلکہ بعض اوقات خود مسائل پیدا کرتے ہیں تاکہ اپنی طاقت اور سرکاری محکموں کی قوت سے عوام کو دبا کر رکھ سکیں۔ ان حالات میں جب تک کوئی فرد یا جماعت' عوام کے حقیقی مسائل کو سمجھنے کے بعد انھیں اپنے مقامی چودھریوں اور ان کے مددگار محکموں کے متعلقہ افراد کی چیرہ دستیوں سے نجات دلانے کی کوشش نہ کرے' عوام قیادت بدلنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے۔

حالات کے اس تجزیے کے بعد میں نے خود یہی راستہ اختیار کیا اور ایک طرف تو پورے ضلع میں جماعت کی تمام مقامی شاخوں کو یہ ہدایت کی کہ بے شک ان کا منصب ایک داعی حق کا منصب ہے' تھانیدار اور داروغہ کا منصب نہیں ہے لیکن ان کچلے اور پسے ہوئے محروم و مظلوم عوام کے مسائل کو سمجھنا اور ان

کے حل کے لیے ان کی مدد اور رہنمائی کرنا' آپ پر لازم ہے۔ اس لیے ہر مقامی جماعت کے ہاں ایک شعبہ خدمت خلق اور دفتر شکایات کا ہونا ضروری ہے جس میں مقامی بااثر لوگوں کی زیادتیوں اور ظلم و ستم اور مختلف محکموں کے افسران کی دھاندلیوں کے خلاف لوگوں سے باقاعدہ تحریری درخواستیں وصول کی جائیں اور پھران کے مسائل حل کرنے کے لیے پورا زور لگایا جائے۔ چنانچہ ہم نے پورے ضلع میں اسی طرز پر کام کو منظم کیا ہے۔ مقامی جماعتیں عوام کی شکایات مقامی طور پر دور کرنے کے لیے اپنے ذرائع و وسائل استعمال کرتی ہیں اور ضرورت پڑے تو امیر ضلع کی مدد سے ضلعی افسران سے مل کر اور اگر ناگزیر ہو تو پریس اور عوامی پلیٹ فارم کو استعمال کر کے عوام کی شکایات کے ازالے کے لیے تگ و دو کرتی ہیں۔

بہ حیثیت امیر ضلع' میرا طریقہ یہ ہے کہ میں ایک طرف تو ضلع کے تمام عوامی مسائل پر نگاہ رکھتا ہوں۔ جہاں جاتا ہوں وہاں کے تمام بااثر افراد سے خواہ وہ جماعت کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں' ملاقات کرتا ہوں۔ اس میں حکام' علما' پیر اور دوسرے بااثر افراد شامل ہوتے ہیں۔ پھر میں کمروں کی بجائے چوپال میں بیٹھتا ہوں یا کھلے میدان میں عوام سے خطاب کرنے کے بعد ان کی ضروریات اور شکایات معلوم کرتا ہوں اور موقع پر ہی ان کی درخواستیں لکھوا کر ساتھ لے لیتا ہوں۔ خطاب کے بعد فوراً چلا نہیں آتا۔ ان کے پاس بیٹھ کر تبادلہ خیال کرتا ہوں۔ مقامی مسائل کے لیے وہیں پر کمیٹی بنا دی جاتی ہے جو متعلقہ محکموں اور افسران سے میری ہدایت کے مطابق خط و کتابت کرتی اور وفود بنا کر ملتی ہے۔ تمام شکایات' درخواستوں' یاد دہانیوں اور کارروائیوں کا ریکارڈ مقامی طور پر محفوظ اور موجود رہتا ہے۔ اس طرح ہم عوام کے بیشتر مسائل حل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ سرکاری دفاتر میں رشوت کی وبا کی وجہ سے بعض اوقات ٹال مٹول کا رویہ بھی اختیار کیا جاتا ہے لیکن مسلسل تعاقب اور دباؤ کی وجہ سے محکمے ہماری بات تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بالفرض اگر کسی وقت کوئی کام نہ ہو سکے تو پوری بات اور اصل حقائق عوام کے سامنے رکھتے ہیں۔

اس طرح کام کر کے ہم نے ایک طرف تو عوام کو محرومی' مایوسی اور بے بسی کے احساس سے محفوظ رکھا ہے' اور دوسری طرف انھیں انتہاپسندی کی راہ پر چلنے اور انتہاپسند عناصر کے چنگل میں پھنسنے سے بچا لیا ہے۔ یہی عوام کو متبادل اور صحیح قیادت فراہم کرنے کا طریقہ بھی ہے۔

س: اس سلسلے میں آپ تحریک کے کارکن سے کیا کہنا پسند کریں گے؟

ج: امرواقعہ یہ ہے کہ یہ کام اگر کوئی تحریک سچائی کے ساتھ انجام دے سکتی ہے تو وہ جماعت اسلامی ہی ہے۔ دعوت اسلامی کے کام میں اخلاص نیت' عمل پیہم اور قربانی و ایثار بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس طرح تحریک اسلامی کے کارکن دوسری جماعتوں اور تنظیموں کے کارکنوں سے نمایاں اور ممتاز نظر آنے لگتے ہیں اور وہ معاشرے میں اپنا وجود منوا سکتے ہیں۔ ہمارے کارکنوں کی زندگی میں تصنع اور بناوٹ قطعاً نہیں ہونا چاہیے۔ مصنوعی طریقے سے "عوامی" بننے کی کوئی غیر معقول حرکت نہیں ہونی چاہیے۔ کارکنوں کے

لیے سیدھا طریقہ یہ ہے کہ جسم و جان کی ساری صلاحیتیں اور مال و دولت میں سے انھیں جو حصہ بھی ملا ہے، اس کو اللہ کی راہ میں اور اس کی مخلوق کی خدمت میں صرف کر ڈالیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے لیے کچھ بھی بچا کر نہ رکھیں۔ اس اخلاص و ایثار کا نتیجہ لازماً یہ نکلے گا کہ عوام دل و جان سے ایسے کارکنوں اور ایسی تحریک کے ساتھ ہو جائیں گے۔

عوام میں اسلام کی بات پھیلانے کے لیے اہم بات یہ ہے کہ جس دعوت کو ہم پیش کریں، اس کے لیے محض کتابوں کو کافی نہ سمجھیں۔ کیونکہ اگر محض کتاب کوئی انقلاب برپا کر سکتی تو قرآن مجید کے ساتھ حضور نبی اکرمؐ کو مبعوث نہ کیا جاتا۔ کتابیں علم و دانش عطا کرتی ہیں لیکن انقلاب جیتے جاگتے انسان برپا کرتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن و حدیث پر مشتمل لٹریچر پڑھ کر ہم اس دعوت کا چلتا پھرتا نمونہ بن جائیں۔ لوگ اوراق پر لکھی ہوئی کتاب کو پڑھنے سے پہلے داعی کی کتاب زندگی پڑھنا چاہتے ہیں۔

ایک اور اہم بات جس پر میں خود عمل کرتا ہوں اور تحریک کے ہر کارکن کو اسے اپنانے کی نصیحت کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ تحریک کے راستے میں استقامت اختیار کرنی چاہیے۔ ایسی استقامت کہ نہ تو مایوس ہو کر ہم تھک ہار کر بیٹھ جائیں اور نہ بے صبر ہو کر اشتعال کی راہ اختیار کریں، بلکہ پورے عزم اور حوصلے کے ساتھ زندگی کی آخری سانس تک اللہ کی راہ پر قائم رہتے ہوئے لوگوں کو اس راہ کی طرف بلاتے رہیں--- اور اپنے تمام دنیاوی مفادات کے مقابلے میں اللہ کے دین کے کام کو--- اور ہر دوسری فکر پر غلبہ اسلام کی فکر کو ترجیح دیں۔

س: پاکستان کی اسلامی تحریک کو اپنی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

ج: میری رائے اور مشورہ یہ ہے کہ ہمیں اب اپنے نصب العین کی بات ہر شخص کو سمجھانی چاہیے--- اب تک ہم بنیادی طور پر پڑھے لکھے لوگوں سے بات کرتے رہے ہیں، لیکن وقت آگیا ہے کہ ہم ہر شخص سے بات کریں۔ کیا تانگے والا اور کیا ریڑھی والا، ہم انھیں بتائیں کہ تمھاری اصل ضرورت یہ ہے کہ تمھارے ملک میں انصاف کا دور دورہ ہو۔ تمھارے حکمران عوام کے ساتھ سچ بولیں اور تمھارے معاشرے میں دیانت داری کا چلن ہو۔ یہ سب کچھ تمھیں اسلامی نظام دے سکتا ہے۔ سچائی، انصاف اور دیانت دوسرے کسی نظام سے نہیں مل سکتے--- ہمیں یہ باتیں سب سے کہنی چاہییں۔ پڑھے لکھے لوگوں کو ہم یہی چیزیں اپنے لٹریچر کے ذریعے سمجھاتے رہے ہیں۔ اب عام لوگوں کو خود مل کر سمجھانی چاہییں۔

آج عرف عام میں جن لوگوں کو غنڈے، بداخلاق اور بدمعاش کہا جاتا ہے، یہ وہی افراد ہیں جنھوں نے اپنی صلاحیتوں کو بھرپور طریقے پر شیطان کے راستے پر لگا رکھا ہے۔ اگر ہم ان کی صلاحیتوں کا رخ صراط مستقیم کی طرف پھیرنے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ لوگ بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ اپنی صلاحیتوں کا استعمال خوب کرتے ہیں۔ جس کام پر آمادہ ہو جائیں، اس کے لیے ڈٹ جانا، ہر طرح کی قربانی دینا اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر دم لینا، ان کی فطرت ثانیہ ہے۔ ان میں جرأت، دلیری اور اپنے مقصد کے لیے تن

من دھن قربان کر دینے کے اوصاف موجود ہوتے ہیں۔ الجھن یہ رہی ہے کہ عام طور پر ایسے افراد کے ساتھ بات چیت، میل ملاپ اور تعلقات کو خلاف تقویٰ خیال کیا جاتا رہا ہے۔ درحقیقت یہ لوگ جو چوراہوں پر کھڑے اور سڑکوں، ہوٹلوں اور فٹ پاتھوں پر ٹولیوں کی شکل میں آوارہ پھرتے نظر آتے ہیں، اس قوم کا جوہر قابل بن سکتے ہیں۔ ان ہی میں سے ہمیں وہ شاہباز و شاہین میسر آ سکتے ہیں جو سچائی کی راہ میں انقلابی کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ہونا یہ چاہیے کہ جن لوگوں کو تحریک سے روشناس کرانا مقصود ہو، ان سے محض رسمی نوعیت کے روابط پر اکتفا نہ کیا جائے، بلکہ آپ ان کے دکھ درد میں بھی شریک ہوں، ان کی ذہنی الجھنوں، پریشانیوں اور معاشی و معاشرتی مشکلات کو بھی سمجھیں۔ پھر ان کے حسب حال کوئی کتاب دیں۔ کتاب دینے میں جلد بازی صحیح نہیں۔ آپ کو خود بھی لٹریچر پر اتنی گہری نظر ضرور رکھنی چاہیے کہ آپ کو معلوم ہو کہ کون سی کتاب کون سے سوالات کا جواب دیتی ہے اور کون سی الجھنوں کا حل پیش کرتی ہے۔ اس طرح جب آپ کسی سے مفصل ملاقاتیں کر کے اور اس کے ذہن کو پڑھ کر اس کے حسب حال لٹریچر دیں گے تو اسے آپ کا ساتھی بننے میں دیر نہیں لگے گی۔ آپ کی حیثیت دراصل اس حکیم کی ہونی چاہیے جو ایک طرف مریض اور مرض کے اسباب پر گہری نگاہ رکھتا ہو اور دوسری طرف دوائیوں کے خواص بھی اس کے علم میں ہوں۔ اگر آپ اناڑی عطائی کی طرح کام کریں گے جسے نہ مرض اور مریض سے کوئی واقفیت ہوتی ہے اور نہ اپنے دواخانے کی دوائیوں کا صحیح علم ہوتا ہے، تو آپ مریض کو صحت یاب نہیں کر سکیں گے۔

ہر کارکن اس کام کو خانہ پری کے طور پر نہیں بلکہ اس احساس کے ساتھ انجام دے کہ اسے تحریک کی ایک اہم ذمہ داری پوری کرنی ہے اور اس کے ذریعے توسیع دعوت کے ٹھوس نتائج حاصل کرنے ہیں۔ ان سرگرمیوں کو ڈرائنگ روم تک نہیں سمٹ جانا چاہیے۔ اسلامی نظام نشستند و گفتند و برخاستند کے بجائے آگے بڑھ کر اور ایک ایک آدمی تک پہنچ کر کام کرنے سے آ سکتا ہے۔ آپ افراد کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریاں پوری کیجیے، ان شاء اللہ معاشرے کو بدلتے دیر نہیں لگے گی۔

س: جماعت کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے کیا کیا جائے؟

ج: ہمیں تین بنیادی باتوں کی طرف خاص طور پر توجہ دینی چاہیے (۱) تنظیم (۲) تربیت اور (۳) فعال لیڈر شپ۔

۱۔ ہمیں اپنے تنظیمی ڈھانچے کو مضبوط کرنا چاہیے۔ حالات کے چکرا دینے والے اتار چڑھاؤ میں یہ ڈھانچہ بہت کمزور ہو گیا ہے، اسے مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۔ انتخابات کے نتیجے میں حاصل ہونے والے نئے کارکنوں کی تربیت کر کے ان کو تحریک میں جذب کیا جائے۔ اس کے لیے جہاں ان کو لٹریچر پڑھانے اور تربیتی کورس میں سے گزارنے کی ضرورت ہے وہاں اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ سوسائٹی میں ان کا جو حقیقی مقام تھا وہ ان کو دیا جائے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ باا ثر

لوگوں کو مختلف رفاہی اور خدمت خلق کے کاموں کا ذمہ دار بنایا جائے۔

۳۔ نوجوان نسل میں سے جو طبقہ انتخابات میں ہمارے قریب آیا ہے وہ کسی موثر اور فعال قیادت کا خواہش مند ہے۔ تحریک کے ذمہ داروں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی نگرانی میں ایک سرگرم، فعال اور ممکن ہو تو جواں سال قیادت کو آگے لائیں تاکہ پرانے اور نئے افراد کو سنبھالا اور متحرک کیا جا سکے۔

تحریک اسلامی کا اصل سرمایہ اخلاق ہے۔ اسی کے زور سے ہم لوگوں کو اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں۔ اس لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ کارکن اخلاقی لحاظ سے اپنے آپ کو ہر وقت اعلیٰ مقام پر فائز رکھیں۔ تحریک کے بزرگ راہنماؤں اور مخلص کارکنوں نے بڑی قربانیاں دے کر قوم کے سامنے تحریک کے وقار اور اس کے مقام کو بلند کیا ہے۔ اب اگر آپ کی کسی اخلاقی کوتاہی یا معاملات کی خرابی سے کسی جگہ بھی تحریک کی نیک نامی کو بٹہ لگا تو لوگوں کے دل و دماغ تحریک اسلامی کے پیغام کے لیے بند ہو جائیں گے۔ اس لیے تحریک کے کارکنوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ کچھ نقصان اٹھا کر اور ایثار کو شعار بنا کر عوام کے درمیان اپنے معاملات کو درست اور باوقار رکھنے کی فکر کریں۔

عوام الناس کارکنوں کا صرف انفرادی تقویٰ اور نماز روزہ ہی نہیں دیکھتے بلکہ وہ ان کے معاملات پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ اس لیے نظم جماعت کے ذمہ داروں کا فرض ہے کہ وہ اس پہلو سے کوئی ڈھیل نہ پیدا ہونے دیں۔ کام میں کوتاہی تو برداشت ہو سکتی ہے لیکن ارکان اور کارکنوں کی اخلاقی کمزوریاں اور لوگوں کے ساتھ ان کے معاملات نظرانداز کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ معاملات کی خرابیوں کو برداشت کر لینا جماعت کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔ لہٰذا جب کسی کارکن کے بارے میں کسی ایسی کوتاہی کا پتا چلے، تو وہاں کی پوری جماعت کو پورے خلوص، ہمدردی اور جذبہ خیر خواہی کے ساتھ اپنے اس ساتھی کو سنبھالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ورنہ وہ خود بھی ضائع ہو گا اور اپنی بری مثال سے دوسروں کے لیے بھی غلط راستہ کھول دے گا۔ اگر اصلاح نہ ہو سکے تو ایسے آدمی کو ایک لمحے کے لیے بھی جماعت کے ساتھ وابستہ نہیں رکھنا چاہیے۔

جماعت اسلامی اس بحرانی دور سے گزرتے ہوئے اپنے خلوص، پیہم جدوجہد اور مسلسل کام کے ذریعے چند برسوں کے اندر اندر کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہے اور جماعت اسلامی کی کامیابی پاکستان میں اسلامی نظام کی سربلندی کا اعلان بن کر آئے گی۔ ان شاء اللہ! ("آخری انٹرویو" قاضی رحمت اللہ۔ ہفت روزہ آئین، اشاعت خاص ڈاکٹر نذیر احمد شہید"، جلد ۱۰، شمارہ ۲۷-۲۸، ۲ جمادی الاول ۱۳۹۲ھ، ۱۵ جون ۱۹۷۲ء، ص ۱۴، ۱۵، ۲۰، تدوین: م - س)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

جو شخص دو رکعت نماز اس طرح پڑھے کہ اس میں غافل نہ ہو، اللہ تعالیٰ اس کے پہلے تمام گناہ معاف کر دے گا۔ (مسند احمد، مشکوٰۃ)

یاد رفتگاں

مولانا علی میاںؒ

پروفیسر خورشید احمد

بیسویں صدی نے ملت اسلامیہ کے جسم و جان پر بہت سے تیشے چلائے اور خصوصیت سے اس کے آخری عشرے میں تو کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ ایک طرف افغانستان کے جہاد میں بے پناہ قربانیاں دی گئیں، فلسطین لہولہان ہے، مسجد اقصیٰ محبوس و محصور ہے، بوسنیا اور کوسووا میں خون کی ندیاں بہائی گئیں، کشمیر جل رہا ہے، اور شیشان میں خون مسلم کی ارزانی حد سے گزر گئی ہے، تو دوسری طرف اس صدی میں اسلامی فکر کی معمار اور اسلامی احیا کی تاریخ ساز شخصیات ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں۔ چلتے چلتے بھی بیسویں صدی ایک اور چرکا لگا گئی۔ برعظیم پاک و ہند کے صف اول کے دینی رہنماؤں کی آخری نشانی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی جدا ہو گئے۔ ۲۳ رمضان المبارک بروز جمعہ، ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹، نماز جمعہ سے کچھ ہی قبل، تلاوت قرآن میں مصروف مولانا علی میاں ایک عالم کو سوگوار چھوڑ کر رب حقیقی سے جا ملے--- انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آنکھیں اشک بار ہیں، روح مضطرب و افسردہ ہے لیکن دل اللہ کے فیصلے پر مطمئن ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ○ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ○ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○ (الرحمٰن ۵۵:۲۶-۲۸) (ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔ پس اے جن و انس، تم اپنے رب کے کن کن کمالات کو جھٹلاؤ گے؟)۔

سید ابوالحسن علی ۱۱ محرم ۱۳۳۳ھ (جنوری ۱۹۱۳ء) رائے بریلی یوپی کے ایک ایسے معزز و محترم خانوادہ سادات میں پیدا ہوئے جو رشد و ہدایت اور دعوت و جہاد میں بڑا نام رکھتا تھا۔ مجاہد ملت حضرت سید احمد شہید کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔ علی میاں کے والد اور والدہ دونوں علم و تقویٰ کے اعلیٰ مرتبے پر تھے۔ آپ کے والد مولانا حکیم عبدالحی لکھنوی نزھۃ الخواطر کے مولف تھے جو پانچ ہزار نامور ہندستانی مسلمانوں کے تذکرے پر مبنی ایک انسائیکلوپیڈیا ہے اور گل رعنا بھی آپ ہی کی تالیف ہے جو اردو کے نامور شعرا کا پہلا مربوط تذکرہ ہے۔ مولانا عبدالحی ندوۃ العلما کے مہتمم اور دینی اور علمی حلقوں میں ایک اونچا مقام رکھتے تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ خیر النساء حافظ قرآن اور حسن اخلاق اور تقویٰ و شرافت کا نمونہ تھیں۔ بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی، والد کے انتقال کے بعد علی میاں کے مربی بنے۔ وہ دینی اور دنیوی علوم کے جامع، ندوہ

کے فارغ التحصیل اور والد کے انتقال کے بعد اس کے ناظم تھے۔ علی میاں نے حفظ قرآن کے بعد عربی، فارسی اور اردو میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پھر ندوہ، دیوبند اور مدرسہ قاسم العلوم لاہور (مولانا احمد علی) سے علوم دینی کی تحصیل کی۔ ۱۹۳۴ میں ندوۃ العلما لکھنؤ میں تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۵۱ میں ندوۃ کے مہتمم مقرر ہوئے۔ اس ذمہ داری کو انھوں نے آخری عمر تک نبھایا۔ چھوٹی بڑی ۱۸۷ کتب و رسائل کے مولف تھے۔ دعوت و تبلیغ اور درس و تدریس کے ذریعے لاکھوں انسانوں تک اللہ کے دین کو پہنچانے کا فرض ادا کیا، مشرق و مغرب اور عرب و عجم میں یکساں مقبولیت حاصل کی۔ عالم اسلام کے اعلیٰ ترین اعزازات حاصل کیے اور سب سے بڑھ کر دنیا کے ہر گوشے میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پروانوں کے دلوں میں عزت اور محبت کا مقام پیدا کیا۔ دنیا میں رہے لیکن دنیا کی آلائشوں سے دامن بچائے رکھا۔ دعوت و تبلیغ کو زندگی کا مشن بنایا اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ج فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ (الاحزاب ۳۳: ۲۳)
ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا۔

مجھے نصف صدی کے چوٹی کے اہل علم و فضل سے ملنے اور ان سے استفادہ کرنے کی سعادت حاصل رہی ہے لیکن علی میاںؒ ان منتخب بزرگوں میں سے ہیں، جن کی شخصیت سب میں منفرد تھی:

آفاق ہا گردیدہ ام
مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام
لیکن تو چیزے دیگری

مولانا علی میاں سے میرا تعارف ان سے بالمشافہ ملاقات سے بہت پہلے ان کی تصانیف کے ذریعے ہوا۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے اولیں دور ہی میں ان کی کتاب سیرت سید احمد شہید پڑھی اور اس کتاب سے نہ صرف سید احمد شہید ہی سے گہرا قلبی تعلق قائم ہوا بلکہ خود مولانا علی میاں کی شخصیت بھی دل میں گھر کر گئی۔

مولانا علی میاں کے بڑے عزیز دوست اور ساتھی مولانا مسعود عالم ندوی نے، جن سے میرا بہت ہی قریبی تعلق تھا اور جمعیت کے اس دور کے تمام ہی ذمہ دار، ان سے بہت گہرا ربط رکھتے تھے اور وہ بھی ہم سب پر بڑی شفقت فرماتے تھے، مولانا علی میاں کی محبت اور عظمت کے نقوش ہمارے دلوں پر مرتسم کر دیے۔ ان کے علم و فضل، ان کی للّٰہیت اور کیفیت عبادت، ان کی عربی دانی اور شوق دعوت و تبلیغ، یہ سب دل و دماغ پر نقش ہو گئے۔ ان کی کتاب انسانی دنیا پر مسلمانوں کے زوال کے اثرات جو ان کی شہرہ آفاق عربی کتاب ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین کا اردو ترجمہ تھا، پڑھی جس نے فکر و نظر ہی کو جلا

نہ بخشی بلکہ روح کو تڑپا اور گرما بھی دیا۔ اس کے بعد مولانا علی میاں کی ہر تحریر بڑے ذوق و شوق سے پڑھی اور اس طرح دل و نگاہ میں ان کی شخصیت کا ایک خاص مقام بن گیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے بعد میں نے جس شخصیت کی تحریروں سے سب سے زیادہ استفادہ کیا، وہ مولانا علی میاں ہی ہیں۔

مولانا علی میاں سے پہلی ملاقات ۱۹۵۴ میں لاہور میں ہوئی۔ میں اس وقت جمعیت کا ناظم اعلیٰ تھا۔ بالمشافہہ ملاقات میں ان کو اس ذہنی تصویر سے ہم آہنگ پایا جو ان کی کتب کے مطالعے سے بنائی تھی۔ آخری ملاقات برطانیہ میں ۱۹۹۶ میں ہوئی جب وہ اسلامک فاؤنڈیشن میں تشریف لائے اور خطاب فرمایا۔ ہمارے ساتھ خصوصی نشست بھی ہوئی اور پھر اس کے بعد ٹوٹنگھم میں مسجد اور دارالعلوم کے افتتاح کی تقریب میں، میں نے، خرم اور مناظر احسن نے شرکت کی۔ یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔ درمیان کے ۴۲ برسوں میں درجنوں بار ان سے ملنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا اور الحمدللہ ان کی شفقت اور ان کے پیار میں اضافے ہی کا گمان رہا۔ میرے لیے تو وہ استاذ، مربی اور محسن تھے لیکن یہ ان کی عظمت ہے کہ انھوں نے اس طرح معاملہ کیا کہ لطف عام بھی لطف خاص کا مزہ دے گیا۔

مولانا علی میاں ایک نامور عالم دین، ایک بلند پایہ مصنف اور دانش ور، ایک صاحب طرز ادیب، ایک سحر انگیز خطیب اور ایک منفرد مؤرخ اور سیرت نگار تھے لیکن سب سے بڑھ کر وہ ایک داعی، ایک مبلغ، ایک مصلح اور ایک صاحب دل مزکی اور مربی تھے۔ ان تمام اوصاف کے اجتماع نے ان کو بیسویں صدی کے اسلامی احیا کے معماروں میں ایک درخشاں مقام پر متمکن کیا۔ میں جب بیسویں صدی کی اسلامی فکر کی قوس قزح پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے ان کا فکر و اسلوب ایک ایسا گلدستہ معلوم ہوتا ہے جس میں اس دور کے کئی اہم مفکرین اور داعیوں کے متفرق پہلوؤں کا اجتماع نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں علامہ اقبال کا سوز و گداز، مولانا مودودی کی عقلیت اور تصور دین کی جامعیت، علامہ شبلی اور مولانا سلیمان ندوی کا ذوق تاریخ اور مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد الیاس، مولانا عبدالقادر رائے پوری اور مولانا محمد زکریا کی روحانیت کا امتزاج نظر آتا ہے۔ علی میاں کے یہاں یہ سب ایک دوسرے کے ناقض نہیں، ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں۔ اور یہی وہ نکتہ ہے جسے ناقدین علم و فن نے نظرانداز کر دیا ہے۔

مولانا علی میاں کا اصل میدان تاریخ اور دعوت ہے، سیرت اور انسان سازی ہے، روح کی بیداری اور امت کی ترقی کے لیے اسلاف کے نمونے کا احیا ہے۔ ان کے یہاں خانقاہ اور جہاد، تزکیہ اور انقلاب دونوں دھارے ساتھ ساتھ رواں نظر آتے ہیں۔ کبھی وہ ایک کو نمایاں کرتے ہیں اور کبھی دوسرے کو۔ پہلی تالیف سے (جو ۱۹۳۹ میں شائع ہونے والی سیرت سید احمد شہید تھی) آخری کتاب (تاریخ دعوت و عزیمت) تک تزکیہ اور جہاد کا چولی دامن کا ساتھ باقی رہتا ہے۔ ان کا ذوق اور خاندانی اور دعوتی ماحول جب ان کو دین کی جدید تعبیر و تفہیم کے باب میں کچھ خدشات اور خطرات سے دوچار کرتا ہے، اور وہ کچھ تصور

اور اسالیب کے بارے میں تردد اور اضطراب کا اظہار کرتے ہیں تب بھی دین اور قوت کے تعلق، احیا اور اقامت کی خواہش اور طلب، اسلامی حکومت کے قیام اور غلبے کی تمنا کے اظہار پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔ دعوت و عزیمت کی آخری جلد میں سیرت سید احمد شہید کے پہلے ایڈیشن کی ان عبارتوں کو جوں کا توں رکھتے ہیں جن میں قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ ۱۹۷۷ میں شائع ہونے والی سیرت سید احمد شہید (سلسلہ تاریخ دعوت و عزیمت) حصہ اول میں کتاب سے اسی مقصد کا اعادہ کیا گیا ہے جو ۱۹۳۶ میں رقم کیا گیا تھا یعنی "اسلام کی خدمت اور نوع انسانی کی سعادت کا ایک ہی لائحہ عمل ہے جو اس کتاب میں بیان کیا ہے، اور وہ وہی ہے جس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپؐ کے خلفاے راشدینؓ اور بعض مجددین امت نے عمل کیا، یعنی دنیا میں اسلامی شریعت اور خلافت کا صحیح نظام قائم کرنا اور اسلام کے اخلاقی، روحانی، مادی، سیاسی غلبے کی کوشش کرنا" (ص ۳۷)۔ پھر سید صاحب کی سیرت پر اجمالی نظر کے باب میں دعوت دین کا کام کرنے والے تمام بزرگوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے صاف الفاظ میں لکھتے ہیں کہ "نفس کے مجاہدے کے ساتھ کفار سے جہاد" اور "شرعی حکومت" کا قیام اسوہ رسالتؐ مآب کا جزو لاینفک ہے۔ دعوت اور خدمت کے تمام کام اہم اور لائق تحسین لیکن "ان سب کے حلقے اور عمل کے دائرے محدود ہیں" اور "سید صاحب نے اس نکتے کو اچھی طرح سمجھا کہ حکومت الٰہی کے قیام اور اسلامی نظام، قوانین و حدود کے اجرا اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر یہ سب کوششیں "کوہ کندن و کاہ برآوردن" ثابت ہوں گی" (ص ۵۰-۵۱)۔

مولانا علی میاں کا میدان عمل سیاست نہ تھا۔ ان کی جملہ کاوشیں دین کے ہمہ گیر اور جامع تصور کی تشریح و توضیح پر مبنی ہیں اور وہ ہمیشہ ملت اسلامیہ کے عروج اور غلبے کا خواب دیکھتے رہے۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ جب ۱۹۸۰ میں انھیں فیصل ایوارڈ ملا تو اس کے ساتھ ملنے والی رقم کا نصف انھوں نے جہاد افغانستان کے لیے اور نصف تحفیظ القرآن کے مدارس کے لیے وقف کیا۔ ملت اسلامیہ کا کوئی بھی مسئلہ ہو، اس پر ان کا موقف ہمیشہ اسلام اور امت مسلمہ کے بہترین مفاد کے مطابق ہوتا تھا۔ بھارت کے مسلمانوں کے لیے انھوں نے دعوت و تبلیغ اور اصلاح معاشرہ کے ساتھ مسلم پرسنل لا کے تحفظ، شاہ بانو کیس میں اسلامی قانون کی بالادستی، اسکولوں میں بندے ماترم کے خلاف احتجاج کی قیادت کی اور بابری مسجد کے سلسلے میں مجاہدانہ موقف اختیار کیا۔ عالم اسلام کے مسائل خواہ ان کا تعلق فلسطین سے ہو یا افغانستان سے، کشمیر سے ہو یا بوسنیا سے، انھوں نے حق اور انصاف کے مطابق پوری جرأت سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ بین الاقوامی پلیٹ فارم پر ہمیں بارہا ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ بھارت کی حکومت نے بار بار کوشش کی کہ کشمیر کے معاملے میں ان سے کوئی بات اپنی تائید میں کہلوائیں لیکن انھوں نے کبھی ایسا نہ کیا۔ نجی گفتگو میں ہمیشہ یہ کہا کہ کشمیر کے لوگوں کا حق ہے کہ اپنے مستقبل کا فیصلہ اپنی مرضی سے کریں۔

مولانا علی میاں کو پاکستان سے گہری محبت تھی اور نفاذ شریعت کی ہر کوشش کے وہ موید رہے۔ وہ زور

دیتے تھے کہ اللہ سے کیے ہوئے وعدے کو پورا کرو۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر جو تقریر انھوں نے کی اور جن جذبات کا اظہار اپنی خود نوشت کاروان زندگی (جلد دوم) میں کیا، وہ پڑھنے کی چیز ہے۔ اپنی پہلی ملاقات میں، جنرل ضیاء الحق کو مسجد اقصیٰ کا ماڈل پیش کیا اور جو الفاظ اس موقع پر ادا کیے وہ ان کے جذبۂ ایمانی، امت سے محبت اور حق و باطل کی کش مکش میں مسلمانوں کے کردار کے بارے میں ان کے تصور کے عکاس ہیں: "اس ہدیے میں (زبان حال سے) اشارہ بھی تھا کہ مسجد اقصیٰ کی بازیافت اور اس کا استخلاص بھی ایک صاحب ایمان، مسلم صدر مملکت کی ذمہ داری میں ہے (ہوا نے چراغ، حصہ سوم)۔

مولانا علی میاں کا اسلامک فاؤنڈیشن سے بڑا گہرا قلبی تعلق تھا۔ جب بھی برطانیہ تشریف لاتے، فاؤنڈیشن ضرور آتے۔ مولانا کی کئی کتابوں اور تقریروں کی انگریزی میں اشاعت کی سعادت بھی فاؤنڈیشن کو حاصل ہوئی۔ ۱۹۹۶ میں نونگھم کی مسجد میں اپنے عام خطاب میں مولانا مودودی اور ان کی علمی اور دینی خدمات کو بڑے موثر الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔ فاؤنڈیشن کے کام کی حوصلہ افزائی فرمائی، نام لے کر خرم اور راقم کی مساعی کے لیے کلمات خیر ارشاد فرمائے اور مسلمانوں کے تمام دینی کام کرنے والوں کے درمیان اتفاق اور تعاون کی نصیحت فرمائی۔ مولانا علی میاں نے مولانا مودودی سے اپنے علمی اختلافات کا بھی اظہار بڑے شائستہ انداز میں کیا ہے، اور ان کی خدمات کا اعتراف بھی بڑے کھلے دل سے کیا ہے بلکہ خود اپنے فکری سفر میں ان سے استفادے اور ان کے اثرات کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ ندائے ملت میں مولانا مودودی کی وفات پر ان کا انٹرویو دیکھنے کی چیز ہے۔

اس امر کے اظہار میں کوئی مبالغہ نہیں کہ مولانا علی میاں صرف اردو ہی کے صاحب طرز ادیب نہ تھے بلکہ عربی زبان پر انھیں غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ انھیں بلاشبہ بیسویں صدی کا عربی کا سب سے اچھا غیر عرب ادیب قرار دیا جا سکتا ہے۔ عربی زبان کا شوق ان کو بچپن ہی سے تھا۔ اقبال کی ایک نظم (چاند) کا عربی ترجمہ انھوں نے ۱۶ برس کی عمر میں کیا اور خود اقبال سے داد لی۔ ان کا پہلا عربی مضمون سید احمد شہید پر سید رشید رضا کے مشہور مجلّہ المنار میں ۱۹۳۷ میں شائع ہوا۔ اس وقت مولانا علی میاں کی عمر ۱۷ سال تھی۔ اقبال کو عرب دنیا میں متعارف کرانے کی سعادت سب سے پہلے علی میاں کو حاصل ہوئی۔ ان کی کتاب **روائع اقبال** (جس کا اردو ترجمہ **نقوش اقبال** کے عنوان سے شائع ہوا ہے) اس سلسلے کی سب سے کامیاب کوشش ہے۔ عرب دنیا ان کی فصاحت اور بلاغت کا لوہا مانتی ہے۔

علی میاں کو عالم اسلام کے اہم ترین اعزازات حاصل ہوئے۔ جامعہ دمشق اور جامعہ مدینہ میں ان کو وزٹنگ پروفیسر کا مقام حاصل تھا۔ ۳۰ سے زائد ممالک میں بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمی نار میں شرکت فرمائی۔ آکسفورڈ سنٹر آف اسلامک اسٹڈیز کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے صدر تھے۔ ۱۹۸۰ میں فیصل ایوارڈ ملا۔ ۱۹۹۹ میں دوبئی میں ۱۹۹۸ کی اہم ترین اسلامی شخصیت کا ایوارڈ دیا گیا۔ رابطہ عالم اسلامی اور جامعہ اسلامیہ مدینہ یونی ورسٹی کے بانی ارکان میں سے تھے۔ موتمر عالم اسلامی لبنان کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ مسلم

پرسنل لا بورڈ کے صدر اور مسلم مجلس مشاورت ہند کی شوریٰ کے رکن تھے۔ علی میاں صرف ہندستان کے مسلمانوں کے گل سرسبد ہی نہیں، پوری اسلامی امت کا سرمایہ تھے اور ان کے قلم اور زبان نے پوری دنیا کے مسلمانوں کی خدمت اور رہنمائی کی۔

مولانا علی میاں نے دعوت و تبلیغ کا کام اپنے طالب علمی ہی کے دور سے شروع کر دیا تھا۔ ندوۃ العلما ان کی علمی سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت سے بھی ان کی زندگی کے مختلف ادوار میں گہرا تعلق رہا۔ اخوان المسلمون اور اسلامی احیا کی تمام ہی اہم تحریکوں سے ان کا گہرا ربط تھا۔ اسلامک فاؤنڈیشن سے بھی موصوف کو خصوصی تعلق تھا۔ خود مجھے گذشتہ ۵۰ برس سے ان کی مشفقانہ سرپرستی کا شرف حاصل رہا اور ان کی وفات کو بالکل اس طرح محسوس کرتا رہا ہوں جس طرح اپنے والد محترم اور مشفق اساتذہ اور رہنماؤں خصوصیت سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی کی شفقت اور سرپرستی سے محرومی کو محسوس کیا تھا۔

میں نے مولانا مودودی اور مولانا علی میاں دونوں کے افکار اور کارناموں سے خوشہ چینی کی ہے لیکن دونوں کے مزاج اور اسلوب میں جو فرق تھا اسے میں کبھی کبھی اس طرح بیان کرتا ہوں کہ مولانا مودودی انسان کے دماغ کے ذریعے اس کے دل میں اترتے ہیں اور قلب و نظر پر چھا جاتے ہیں، جب کہ مولانا علی میاں دل کے راستے فکر و نظر کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں اور روح کو تازگی فراہم کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس دور کے مسلمانوں کے ان دونوں محسنوں کو بہترین اجر سے نوازے، ان کے درجات بلند کرے اور جو شمعیں انھوں نے روشن کی ہیں، وہ ہمیشہ تابندہ رہیں۔

مولانا علی میاں نہ صرف میرے اور میری نسل کے مسلمانوں کے بلکہ پوری امت مسلمہ کے محسن تھے۔ ان کی زندگی میں سلف کے بزرگوں کی جھلک دیکھی جا سکتی تھی اور وہ ایک خلق کے لیے چشمہ نور و ہدایت تھے۔ ان کا تعلق صرف بھارت سے نہیں، پوری دنیا کے مسلمانوں سے تھا اور ہم سب ان کے اٹھ جانے سے اپنے آپ کو پھر سے یتیم محسوس کر رہے ہیں۔ غم شدید ہے مگر اللہ کے فیصلے پر قانع ہیں اور ان کے لیے دل کی گہرائیوں سے مغفرت اور رفع درجات کی دعائیں کرتے ہیں اور رب حقیقی سے دعا بھی کرتے ہیں کہ اس امت کو ان جیسے حق کی طرف بلانے والوں اور دین کا احیا کرنے والوں سے برابر سرفراز فرماتا رہے تاکہ رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ تاقیامت جاری رہے۔

اللہ تعالیٰ مولانا علی میاں کو جنت کے اعلیٰ ترین درجات میں جگہ دے اور ان کے تمام لواحقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین!

رسائل و مسائل

شرح منافع کا تعین

سوال : ملٹی نیشنل دواساز کمپنیاں جن میں کئی ایک مقامی ہوتی ہیں' جو ادویات فروخت کرتی ہیں ان پر کسان سے تقریباً ۲۰۰ فی صد سے بھی زیادہ منافع لیا جاتا ہے۔ ان کو کسان کی فلاح و بہبود کا کوئی خیال نہیں ہوتا اور صرف اپنے کاروبار اور منافع کی فکر ہوتی ہے۔ ملازمین کی کارکردگی بھی اسی معیار پر جانچی جاتی ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا ان کمپنیوں کا یہ کاروبار جائز ہے؟ کیا ان میں ملازمت کرنا جائز ہے؟

جواب : دواساز اداروں اور دیگر اداروں میں منافع کی شرح سے متعلق آپ کے سوال کا محرک جذبہ لائق تعریف ہے۔ بلاشبہ اسلام استحصال (exploitation)' مصنوعی طور پر حصول منافع کے لیے بازار میں مانگ پیدا کرنے' یا مال روک کر رکھنے کی شدت سے مخالفت کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ تجارت کو اخلاقی اصولوں کا تابع بنایا جائے۔ چنانچہ آجر اور تاجر کا تعلق ہو یا تاجر اور صارف کا' ہر صورت میں اسلام عدل' توازن اور عدم استحصال کے اصول کو تجارت کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

آپ نے سوال کیا ہے کہ بعض ملکی اور بین الاقوامی تجارتی ادارے کسانوں کے استعمال کی ادویات پر ۲۰۰ فی صد یا زائد منافع کماتے ہیں' اس صورت میں ان کمپنیوں میں ملازمت یا ان کی اشیا کی مارکیٹنگ کرنا شرعاً کہاں تک جائز ہے؟ اس سوال کے دو پہلو ہیں۔ ایک کا تعلق اس چیز سے ہے کہ کیا ایک تجارتی ادارے میں جو زیادہ منافع کما رہا ہو' ایک ایسے تجارتی ادارے کے مقابلے میں جو بہت واجبی نفع کما رہا ہو' ملازمت کرنا افضل اور زیادہ نیکی کا باعث ہے۔ اگر غور کیا جائے تو کسی ادارے میں ملازمت کی بنیاد عموماً اس کا کم یا زیادہ نفع حاصل کرنا نہیں ہوتا' بلکہ جس کام کے لیے ملازم رکھا جا رہا ہے اور جس چیز کا کاروبار کیا جا رہا ہے' یہ دو باتیں فیصلہ کن ہوتی ہیں۔ اگر ایک ادارہ کیمیاوی کھاد بنا رہا ہو اور دوسرا ادارہ شراب کشید کر رہا ہو' لیکن اس شراب کشید کرنے والے ادارے کے منافع کی شرح کم ہو تو کیا اس بنا پر کہ وہاں منافع کی شرح کم یا زیادہ ہے' ایک حرام چیز حلال ہو جائے گی؟

جہاں تک تعلق منافع کی شرح کا ہے' اگر آپ جائزہ لیں گے تو نہ صرف کیمیاوی ادویات بلکہ استعمال

کی اشیا اور اشیاے تزئین میں بعض اوقات شرح نفع مناسب ہو گی اور بعض میں بے حد زیادہ، مثلاً ایک سنار یا سبزی یا پھل فروش تھوک مارکیٹ کے مقابلے میں عموماً ۱۰۰ فی صد یا اس سے زائد منافع رکھ کر اپنا مال فروخت کرتا ہے۔ کیا شرح منافع کی بنا پر اس کا کاروبار اور وہاں کام کرنے والے ملازم معصیت اور حرام کے مرتکب ہو جائیں گے؟

بلاشبہ ۲۰۰ فی صد نفع نامناسب نظر آتا ہے، لیکن صرف اس بنا پر کسی ایسے ادارے میں ملازمت کو حرام نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ہاں، اس ادارے کے مالکان کو متوجہ کرنے کی ضرورت ہو گی کہ وہ عوام کا استحصال نہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ قیمتوں کے تعین میں عدم توازن کی اصلاح کے لیے ایسے ضوابط وضع کرے جن کے ذریعے کوالٹی کنٹرول اور قیمتوں کا مناسب اور عادلانہ نظام قائم ہو سکے۔ اسلام نے تجارت کا جو اخلاقی ضابطہ (work ethics) تجویز کیا ہے اس میں وہ حصول نفع کو اخلاقی اصولوں کے تابع بنانا چاہتا ہے اور ریاست کو نگرانی اور معاینے کا حق دیتا ہے۔ نبی کریمؐ بہ نفس نفیس بازار میں جا کر اجناس میں ہاتھ ڈال کر یہ یقین کیا کرتے تھے کہ جو مال اوپر رکھا ہے وہی اندر بھی ہے یا نہیں۔ اسلامی نظام معیشت میں جہاں اشیا کے معیار کی فکر اور پابندی کی جائے گی وہاں مناسب قیمتوں کا نظام بھی نافذ کیا جائے گا لیکن نفع کا تناسب کتنا ہو گا؟ اس کا انحصار خود کسی شے کی تیاری کے مراحل سے ہے۔ پیداواری ادارے سے لے کر صارف تک درمیان میں آنے والے افراد اور اداروں کے حق منافع کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ عادلانہ نظام میں بھی بعض اشیا میں منافع کا تناسب دیگر اشیا سے زیادہ ہو سکتا ہے (ڈاکٹر انیس احمد)۔

لہو و لعب کی مجالس میں شرکت

س : پی ٹی وی ایوارڈ کی تقریب میں جو فی الاصل محفل موسیقی تھی، آپ کی شرکت پر حیرت ہوئی اور افسوس ہوا۔ آپ جیسی شخصیت کو جو ملک میں دین کی علامت ہیں، لہو و لعب کی مجلس میں دیکھ کر، ہم جیسے عام افراد پر کیا گزرتی ہے، شاید آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہم آپ سے مثال اور نمونہ پیش کرنے کی توقع رکھتے ہیں!

ج : رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ہے کہ الدینُ النصیحۃ ، یعنی دین خیر خواہی، امربالمعروف، خلوص نیت کے ساتھ اپنی اور دوسروں کی اصلاح کرنے کا نام ہے۔ پی ٹی وی ایوارڈ کی تقریب میں شرکت کے حوالے سے آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بلاشبہ نص قرآنی پر مبنی ہیں اور اس حمیت دینی کا اظہار کرتے ہیں جو دین اور مندرجہ بالا حدیث کا مقصود ہے۔ ہمیں اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہماری صفوں میں ایسی بہنیں اور بھائی موجود ہیں جو تکلفات کو درمیان میں لائے بغیر اظہار حق

کرتے ہیں۔ جب تک تحریک اسلامی میں ایک کارکن سے لے کر قیادت پر فائز افراد تک تنقید و احتساب کی آزادی اور اس کا استعمال رہے گا، تحریک اسلامی اور اس کے کارکن راہ راست پر قائم رہیں گے، ان شاء اللہ!

تحریک اسلامی کے کارکنوں کے لیے اولیں دو خلفاے راشدین کے وہ اقوال بنیادی اصول کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں وہ یہ کہتے ہیں کہ جب تک وہ حق پر قائم ہوں ان کی اطاعت کی جائے اور جب وہ حق سے سرموانحراف کریں، انھیں تیر کی طرح سیدھا کر دیا جائے۔

رقص و سرود اور موسیقی کی نشست میں نہ صرف دینی تشخص رکھنے والے کسی فرد کا، بلکہ کسی بھی صاحب ایمان کا، شرکت کرنا قرآن و حدیث کے احکام کی خلاف ورزی ہے۔ سورہ لقمان میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اور انسانوں ہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلام دل فریب (لہو الحدیث) خرید کر لاتا ہے تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے علم کے بغیر بھٹکا دے اور اس راستے کی دعوت کو مذاق میں اڑا دے (۳۱:۶)---- صاحب تفہیم القرآن نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لہو و لعب سے مراد ہر وہ بات یا فعل لیا ہے جو انسان کو اپنے اندر مشغول کر کے کسی دوسری چیز سے غافل کر دے (تفہیم القرآن، ج ۴، ص ۸)۔ اور اس کے منفی معنی کی وضاحت میں گپ، خرافات، ہنسی مذاق، داستانیں، افسانے، ناول، گانا بجانا اور اس قسم کی چیزوں کو شامل کیا گیا ہے۔ گویا "لہو" ایک وسیع تر معنی رکھنے والی اصطلاح ہے۔ طرسوی نے تاج العروس میں اس سے وہ لذت مراد لی ہے جو ناپایدار ہو اور انسان کی توجہ اہم کاموں سے ہٹا کر غیر اہم کاموں کی طرف منعطف کر دے، یا ایسے کاموں میں لگا دے جو عبث ہوں۔ راغب اصفہانی نے اپنی المفردات میں اس سے ایسے امور مراد لیے ہیں جو انسان کو اہم کاموں سے باز رکھیں۔

گویا "لہو" کا اطلاق پی ٹی وی ایوارڈ پر ہی نہیں ہو گا بلکہ ایسی مجالس پر بھی ہو گا جہاں غیر مقصدی ادب، شعروشاعری اور ہنسی مذاق کیا جا رہا ہو اور جو انسان کو مقصد حیات سے دور کرنے والی ہوں۔ سورۃ الانعام میں لہوولعب کی اصطلاح کو دنیا کی زندگی کے حوالے سے استعمال کرتے ہوئے یوں کہا گیا ہے: دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور ایک تماشا ہے (۶: ۳۲)۔

سورۃ الانبیا میں اس کیفیت کو لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ ط (دل ان کے دوسری ہی فکروں میں منہمک ہیں۔ ۲۱:۳) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہاں بھی سیاق و سباق سے واضح ہوتا ہے کہ کھیل کود میں (لعب) میں پڑنا، دل و دماغ سے اصل مقصد حیات کو نگاہ سے اوجھل کر دیتا ہے۔ کہیں اس کی شکل مال کے "تکاثر" کی بھی ہو جاتی ہے چنانچہ (الْهٰى) کے حوالے سے فرمایا گیا: تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے (التکاثر ۱۰۲:۱)--- گویا ہر وہ کام جو اللہ کی یاد سے غافل کرنے والا ہو، خواہ وہ موسیقی ہو، دولت جمع کرنے کی دوڑ ہو، بے مقصد ادب اور شاعری ہو، یا کوئی

ایسی محفل جہاں شعائر اسلام کا مذاق اڑایا جا رہا ہو' اس میں شرکت اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔

جہاں تک سوال ایک خاص فرد کے پی ٹی وی ایوارڈ کی تقریب میں شرکت کا ہے' بہتر یہی ہوتا کہ شرکت نہ کی جاتی۔ لیکن جس صورت حال میں شرکت کی گئی' واقعہ یوں ہے کہ اس شخص کی ملک سے غیر حاضری کے دوران اسے تحریری طور پر دعوت دی گئی کہ پروگرام کے آغاز میں تلاوت قرآن اور نعت خوانی کے حوالے سے افراد کو ایوارڈ دینے کے لیے وہ شرکت کرے۔ معذرت کرنے پر کہا گیا کہ یہ چند لمحات کا معاملہ ہے' تقریب میں بیٹھنا شرط نہیں ہے۔ چنانچہ تقریب کے آغاز ہی میں قرأت و نعت کے حوالے سے ایوارڈ دینے کے فوراً بعد وہ فرد تقریب سے اٹھ کر چلا گیا۔ اگر اس تقریب کو کسی نے ریکارڈ کیا ہو تو دیکھا جا سکتا ہے کہ اولین چند لمحات کے بعد اس تقریب میں شرکت نہیں کی گئی۔ بایں ہمہ احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ چند لمحات کی شرکت سے بھی انکار کر دیا جاتا (ا - ا)۔

کتاب نما

اسلامی جامعات ' تاریخ' نظام' اثرات: پروفیسر عبدالرحیم غنیمہ' ترجمہ: محمد ظہیرالدین بھٹی۔ ناشر: اسلامک پبلی کیشنز' شاہ عالم مارکیٹ' لاہور۔ صفحات: ۳۹۶۔ قیمت: ۱۹۵ روپے۔

زیر نظر کتاب پروفیسر عبدالرحیم غنیمہ کی عربی تصنیف تاریخ الجامعات الاسلامیہ الکبریٰ (۱۹۵۳) کے فارسی ترجمے تاریخ دانش گاہ ہاے بزرگ اسلامی (مترجم ڈاکٹر نوراللہ کسائی) کا اردو ترجمہ ہے۔ کتاب کے مفصل مقدمے میں ڈاکٹر کسائی نے' مسلمانوں کے ہاں عجمی علمی روایت اور شیعی فروغ علم کے دھاروں کو واضح کیا ہے۔ کتاب میں عالم اسلام کے مغربی حصے یعنی اندلس' شمالی افریقہ' مصر اور شام کے علمی و تدریسی مراکز کے بارے میں ایسی تفصیلی معلومات دی گئی ہیں کہ یہ کتاب اسلامی درس گاہوں اور جامعات کی ایک دائرۃ المعارف معلوم ہوتی ہے۔ اس میں اسلامی درس گاہوں کی ۱۳ سو سالہ خدمات کی خوش رنگ تفصیلات میں' روشن پہلوؤں کے ساتھ کمیوں کو بھی بے کم و کاست بیان کیا گیا ہے۔ اس زمانے میں موجودہ مغربی طرز کے امتحانات کے بجاے' طالب علم کے بارے میں استاد کے اطمینان کے نتیجے میں سند فضیلت یا سند فراغت ملا کرتی تھی۔ درس نظامی کے ارتقا کے ساتھ' اس کی خوبیوں' خامیوں اور مختلف رویوں پر سیر حاصل بحث بھی ملتی ہے۔

ایک جگہ انھوں نے بتایا ہے کہ: "پہلے [اسلامی] دارالعلوموں پر کسی خاص فرقے کا رنگ نہیں ہوتا تھا۔ [گویا تمام مکاتب فکر ان علمی مراکز سے کسب فیض کرتے تھے' جس طرح آج ہماری جدید جامعات کے دینی یا سیکولر شعبوں میں ہوتا ہے] مگر آل بویہ کے شیعہ وزیر شاپور بن اردشیر نے دارالعلم بغداد کی شیعہ آبادی (محلہ کرخ) کو شیعہ مذہب کا اہم اڈا بنا دیا۔ یہ روش فاطمی شیعوں نے اپنی مذہبی اور سیاسی تبلیغ کے لیے خوب اپنائی (ص ۴۸)۔

مصنف نے یہ تو بتایا ہے کہ اسلامی جامعات' علوم و فنون اور طبیعی علوم میں آموزش کا بہترین نمونہ تھیں' جن سے اہل مغرب بھی استفادہ کرتے رہے لیکن وہ یہ نہیں بتا سکے' کہ یورپ میں احیاے علوم کے بعد سائنسی اور فنی تعلیم و تحقیق سے ہماری بزرگ دانش گاہوں کا دامن کیوں خالی رہا؟

ایک جگہ' امام غزالی کا ایک دل چسپ قول درج ہے جس میں انھوں نے اس علم کا مذاق اڑایا ہے جو بے مقصد مسائل کی دلدل میں پھنساتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: "اگر علم سے تیرا اولین مقصد یہ جاننا ہے کہ کھجور کی شراب سے وضو جائز ہے؟ کتے کی کھال رنگنے سے پاک ہو جاتی ہے؟ گدھوں کی زکوٰۃ ہو جاتی ہے..... اگر

تو اس قسم کے مسائل سیکھنے کے لیے [دینی درس گاہوں میں] دوڑ دھوپ کرتا ہے، تو یاد رکھ کہ ان باتوں کو جان لینے سے، تیری یا کسی دوسرے کی اصلاح میں کوئی مدد نہیں ملے گی"۔

مجموعی طور پر کتاب معلومات افزا ہے۔ مگر یہ بات کھٹکتی ہے کہ اصل عربی کتاب کے بجائے، اس کے فارسی ترجمے سے اردو ترجمہ کیا گیا ہے (جب کہ فارسی مترجم ایک خاص ذہن رکھتے ہیں اور بہ قول اردو مترجم: اپنے فرقے کی "حمایت و تائید کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے"۔ ص ۱۴)--- ترجمہ در ترجمہ کی سند بہرحال کمزور ہوتی ہے۔

چند توجہ طلب باتیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کے ساتھ ہر جگہ لفظ "صلعم" لکھا گیا ہے۔ بہ قول مولانا مودودی: "یہ ایک بے معنی لفظ ہے"۔ موزوں یہی ہے کہ یا تو صلی اللہ علیہ وسلم لکھا جائے، ورنہ "ؐ" کی علامت۔ گذشتہ دنوں اسلامی نظریاتی کونسل نے لفظ "محمدؐ" کے لیے انگریزی لفظ Mohd کے استعمال کو ناموزوں قرار دیتے ہوئے اس کے استعمال پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ ترجمہ، بعض مقامات پر اسپیڈ بریکر کی صورت اختیار کر جاتا ہے اور بعض جگہ تو سرخ بتی بن کر روک ہی دیتا ہے۔ روانی و سلاست کا خیال رکھنا ضروری تھا۔

کتاب کی عمدہ پیش کش ایک آرٹ ہے اور اس کا تعلق سلیقہ شعاری سے ہے۔ کسی کتاب کی اشاعتی پیش کش میں بے دلی کی روش، قاری کے ذوق مطالعہ کو صدمہ پہنچاتی ہے اور اس کے عزم مطالعہ کو بھی ضعیف کرتی ہے۔ افسوس ہے کہ اکثر کمپوزر اور ناشر حضرات، جمالیاتی احساس سے عاری دکھائی دیتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اس کی ایک مثال ہے۔ متن میں کمپوزنگ کے دو تین سائز، رموز اوقاف کا من مانا انداز، باب کے آغاز، وسط اور اختتام میں ناہمواری--- یہ چیزیں ناشر کے بارے میں برا تاثر چھوڑتی ہیں۔ ابتدا میں اردو زبان میں مذہبی کتب کی پیش کش کا انداز بہت دقیانوسی ہوتا تھا، جسے ندوہ اور دارالمصنفین نے خوش گوار تبدیلی سے آشنا کیا۔ ان کے بعد مولانا مودودی نے کتابی متن کو بیل بوٹوں، لکیروں اور مختلف قسم کے بوجھوں سے آزاد کیا جس سے کتابیں اپنے عہد میں ایک بالکل منفرد شان کے ساتھ معیاری پیش کش کا خوب صورت نمونہ بن گئیں۔ موجودہ اشاعتی اداروں کو دیکھنا چاہیے کہ ہمارا قدم آگے بڑھا ہے یا پیچھے ہٹا ہے؟ **(سلیم منصور خالد)**۔

سیرت ختم الرسلؐ، سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی۔ صفحات: ۱۰۴۔ قیمت: ۱۶ روپے۔

اس مختصر کتاب میں حیات پاکؐ کے ہجرت حبشہ، غزوۂ بدر، غزوۂ احد، غزوۂ احزاب اور صلح حدیبیہ جیسے سنگ ہائے میل پر سید مودودیؒ کی تحریرات کو داعیؐ کے مقام اور مرتبے پر ابتدائی تحریر کے ساتھ مربوط کر کے پیش کیا گیا ہے۔ جدوجہد اور کش مکش، باطل قوتوں سے مرحلہ بہ مرحلہ مقابلہ اور اسلامی

ریاست کے قیام' اس کی بقا اور استحکام کے پہلو سیرت رسول اللہ کے آئینے میں سامنے آتے ہیں۔ جو افراد اور گروہ آج دعوت جہاد اور ہجرت کے مراحل سے گزر رہے ہیں' ان کے لیے اس میں بڑی عملی رہنمائی ہے۔ نبی پاکؐ کے حقیقی نام لیوا وہی ہیں جو امت وسط کے مقام کو پہچان کر وہی دعوت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جو اللہ کے رسولؐ لے کر آئے تھے اور سنت الٰہی کے مطابق پھر انھی مراحل سے گزر رہے ہیں۔ جو دین کے لیے جدوجہد نہیں کرتے' ان کے لیے قرآن اور سیرت کا بیشتر حصہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ سیرت کا اس انداز سے مطالعہ سید مودودیؒ کا ہی حق تھا جو خود اس صدی میں اس پیغام کو لے کر اٹھے۔

اس کتاب کی تحریریں تفہیم القرآن سے اخذ کی گئی ہیں لیکن کہیں کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے' نہ انتخاب کرنے اور ترتیب دینے والے کا کوئی تذکرہ ہے۔ یہ تاثر ملتا ہے کہ جیسے یہ مولانا کی اپنی مستقل بالذات تصنیف ہے۔ تبصرہ نگار کے علم میں اسی عنوان سے اس نوعیت کی ایک کتاب ہے جسے ۶۰ کے عشرے میں پروفیسر خورشید احمد اور احمد انس نے مرتب کیا تھا اور ادارہ مطبوعات طلبہ نے شائع کیا تھا۔ یہاں تو یہ پھر شائع نہیں ہوئی لیکن غالباً اسی کو بھارت میں "جملہ حقوق بحق ناشر" کی صراحت کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ تفہیم القرآن کی تکمیل کے بعد محض واقعات سیرت کے حوالے سے سیرت کی ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جس میں ضمنی اور اضافی مباحث نہ ہوں اور قاری براہ راست حیات طیبہ کے مراحل سے واقف ہو اور اس کے اندر اس قافلے کا شریک سفر ہونے کا جذبہ بیدار ہو (مسلم سجاد)۔

محمود اعظم فاروقی حیات و خدمات' مرتبہ: ندیم اشرف۔ ملنے کا پتا: ۸۵ ڈی شمالی ناظم آباد' کراچی۔ صفحات: ۴۰۰۔ قیمت: ۲۲۵ روپے۔

اسے ایک اچھی روایت ہی قرار دینا چاہیے کہ وفات کے بعد جلد ہی تحریک اسلامی کے رہنماؤں کی حیات و خدمات کے بارے میں مجموعے شائع ہو جائیں اور کسی بہتر اور جامع چیز کے انتظار میں اس طرح کے تذکرے کو ملتوی نہ رکھا جائے۔ ہر انسان کی زندگی میں دوسروں کے لیے رہنمائی اور سیکھنے کا سامان ہوتا ہے لیکن جس شخصیت نے قائد کی حیثیت سے بھرپور اجتماعی زندگی گزاری ہو' اس سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ ندیم اشرف نے فاروقی صاحب مرحوم کے بارے میں اعزہ کے تاثرات' قومی رہنماؤں کی تحریرات' اور تحریکی ساتھیوں کے مشاہدات اور اخبارات و رسائل میں ان کے انتقال کے موقع پر شائع ہونے والے تمام مضامین بڑی محنت سے یکجا کر دیے ہیں۔

ان میں فاروقی صاحب کی باغ و بہار شخصیت کی سب ہی جھلکیاں نظر آ جاتی ہیں۔ معاملات میں ان کا رویہ' تحریک کے لیے قربانی اور خدمت' اور ان کے لطائف وغیرہ۔ ہفتے میں ایک دن وہ اپنے دفتر سے جماعت کے دفتر جانے کے بجائے' گھر آکر اہل و عیال کے ساتھ وقت گزارتے' اس سے خود بھی مسرت محسوس کرتے اور اہل خانہ بھی خوش ہوتے۔

اس طرح کے تذکروں سے ایک ضرورت تو پوری ہوتی ہے لیکن یہ ضرورت باقی ہے کہ کوئی طالب علم ان کی سیاسی اور پارلیمنٹری خدمات و کردار پر مبسوط مقالہ تحقیقی انداز سے لکھے' یا کوئی بحیثیت امیر جماعت اسلامی کراچی ان کی خدمات کا جائزہ لے۔

جن افراد نے محمود اعظم فاروقی صاحب کے ساتھ زندگی کے کچھ دن گزارے' ان کے لیے یقیناً یہ کتاب ایک یادگار تحفہ ہے۔ تحریک اسلامی نے جو افراد تیار کیے' انھیں کہاں سے کہاں پہنچایا' اس کا ایک اندازہ بھی اس کتاب سے ہوتا ہے۔ ندیم اشرف ان کے نواسے ہیں' ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں۔ تحریک کے جو دوسرے کتنے ہی رہنما رخصت ہو چکے ہیں' کیا ان کی خدمات کے ایسے تذکرے مرتب کرنے والا کوئی نہیں؟ (م۔ س)۔

قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کے سائنسی کارنامے' ڈاکٹر غلام قادر لون۔ ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی' نئی دہلی۔ صفحات: ۳۵۰۔ قیمت مجلد: ۱۷۰' پیپر بیک: ۱۳۰ روپے۔

مسلمانوں کے سائنسی کارنامے ایک مقبول و مرغوب موضوع ہے اور غالباً "پدرم سلطان بود" کے جذبے کے تحت' موجودہ سائنسی دور میں اپنی پس ماندگی کی تلافی کرنے کے لیے' اس پر لکھا جاتا ہے۔ لیکن بھارت سے شائع ہونے والی زیر تبصرہ تازہ کتاب' مختصر لیکن اپنے موضوع پر ایک غیر معمولی کتاب ہے۔ یہ توقع بجا ہے کہ اس سے "مسلم طلبہ میں امنگ اور حوصلہ" پیدا ہو گا۔

کتاب کا اصل حسن' اس کے عام فہم اور رواں دواں انداز بیان میں ہے۔ مستند سائنسی مفاہیم کو روز مرہ زبان میں عمدگی سے واضح کیا گیا ہے۔ صاحب کتاب نے عربی میں ایم اے اور تصوف میں پی ایچ ڈی کی ہے اور ان کی دل چسپی کے موضوعات قرآن' حدیث' تصوف' فلسفہ' تاریخ اور علم کلام ہیں۔ عربی' فارسی' اردو' انگریزی' ہندی اور کشمیری چھے زبانوں کے ذخیرے سے براہ راست استفادہ کرنے اور تحریر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے سائنسی کارناموں کا تذکرہ غیر مسلم مفکرین کی کتابوں اور حوالوں سے کیا ہے۔ کتاب کے گیارہ ابواب میں "گیارہ مختلف میدانوں میں مسلمانوں کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں: ۱۔ تاریخ نگاری' ۲۔ جغرافیہ' ۳۔ معدنیات' ۴۔ نباتیات' ۵۔ حیوانیات' ۶۔ کیمیا' ۷۔ طبیعیات' ۸۔ فلکیات' ۹۔ ریاضیات' ۱۰۔ طب' ۱۱۔ فلسفہ۔ ضمناً یہ ذکر بھی آیا ہے کہ بہت سے ایسے امور جن کی دریافت کا سہرا مغربی سائنس دانوں کے سر باندھا جاتا ہے' وہ دریافتیں مسلمان کر چکے تھے اور یہ بتانے والے بھی دیانت دار مغربی اہل قلم ہیں۔ مصنف نے ارتقا کے حوالے سے تفصیل سے بتایا ہے کہ ڈاروِن سے بہت پہلے مسلمان مفکرین کے ہاں بھی اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ نظریہ ارتقا پر اعتراضات ہوتے ہیں کہ یہ سرے سے کوئی سائنسی نظریہ نہیں اور بے خدا تہذیب کی پیداوار ہے۔ غالباً اسی لیے حیوانیات کے باب کے آخر میں

ایک نوٹ کے ذریعے وضاحت کی گئی ہے۔ طب کے باب میں مسلمانوں کے دور عروج کے ہسپتالوں کا ذکر نہایت دل چسپ ہے۔

کتاب کا مطالعہ ایک اعتماد پیدا کرتا ہے کہ ہم نے سائنس میں بھی دنیا کی امامت کی ہے اور اب بھی کر سکتے ہیں۔ ہم خوشہ چینی اور نقالی ترک کریں اور اپنی عقل و فکر کو ہدایت الٰہی کی رہنمائی میں استعمال کریں تو مغرب سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ضرورت ہوگی کہ نئی نسل کو احساس کمتری سے نکال کر خود اعتمادی کے جذبے سے سرشار کیا جائے۔ اس کی ایک عملی تدبیر تاریخ سائنس کا ہر سطح پر لازمی مطالعہ ہے۔ اس کتاب کی بنیاد پر کئی کورس بنائے جا سکتے ہیں (م - س)۔

مرد درویش، مرتبہ: مسعود احمد برکاتی۔ ناشر: ہمدرد فاؤنڈیشن، ہمدرد سنٹر، ناظم آباد، کراچی۔ صفحات: ۱۴۰۔ قیمت: ۷۵ روپے۔

حکیم محمد سعید کی شہادت (۱۷ اکتوبر ۱۹۹۸) کے بعد جلد ہی ان کے برادر بزرگ حکیم عبدالحمید (۱۴ ستمبر ۱۹۰۸ - ۲۲ جولائی ۱۹۹۹) بھی دنیاے فانی سے رخصت ہو گئے۔ خدمت خلق کے جذبے سے سرشار دونوں بھائیوں نے اپنی صلاحیتوں کو قومی اور ملی فلاح و تعمیر کے کاموں میں صرف کیا۔

زیر نظر کتاب میں حکیم عبدالحمید کی شخصیت اور کارناموں کے بارے میں ۱۰ اصحاب کے مضامین جمع کیے گئے ہیں جن سے موصوف کی شخصیت کے گوناگوں پہلو سامنے آتے ہیں، مثلاً: انھوں نے اپنی طویل زندگی نہایت سادگی اور نہایت پابندی وقت سے بسر کی۔ ہر معاملے میں حددرجہ محتاط، صبح میلوں سیر کے عادی، ہر موسم میں ٹھنڈے پانی سے غسل، حتیٰ کہ سرما میں سری نگر میں بھی معمول نہیں بدلا۔ غذا نہایت سادہ، صبح ناشتہ اور شام کھانا فقط، کمرے میں ایک چھوٹی سی میز اور ایک پرانی جھلندری کرسی، نہ قالین، گرمیوں میں ایئرکنڈیشنر نہیں اور سردیوں میں ہیٹر بھی نہیں۔ پرانی چیزوں پر قانع اور مسرور، کپڑوں میں پیوند، اپنے کپڑے خود دھو لیتے، جوتوں پر پالش کبھی کسی سے نہیں کروائی۔ اپنی ذات پر کم سے کم خرچ کے عادی، مختصر یہ کہ موصوف نے ہمیشہ دنیا کی آسایشوں سے بے نیازی اختیار کی۔ برسوں سے ان کا معمول تھا کہ ایک مقررہ دن کو اپنے حجرے میں ایک رات کے لیے معتکف رہتے۔ ایسی منظم، منضبط اور زاہدانہ زندگی کا ثمر کیا ہے؟ ہمدرد کا وسیع کاروبار، ہمدرد یونی ورسٹی تغلق آباد، انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز دہلی، اور اسی طرح کے متعدد ادارے جو ان کے اہل وطن، خصوصاً مسلمانوں کی ترقی کے سلسلے میں آیندہ طویل عرصے تک نہایت مفید خدمات انجام دیتے رہیں گے، اور مرحوم کے لیے صدقہ جاریہ ہیں۔

حکیم عبدالحمید کی زندگی ایک مثال ہے ان لوگوں کے لیے، جو کام کرنے کا عزم رکھتے ہیں مگر انھیں

وقت کی کمی کا شکوہ رہتا ہے۔ انسان کیا کچھ نہیں کر سکتا، بشرطیکہ نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ سرگرم عمل رہے، سمت سفر صحیح ہو اور توفیق الٰہی بھی شامل حال ہو۔

مجموعہ پڑھنے، پڑھوانے کے لائق ہے۔ مضامین میں کہیں کہیں تکرار فطری ہے۔ امید ہے آیندہ مرحوم کی مفصل اور مختصر (دونوں طرح کی) سوانح عمری لکھی، شائع کی جائے گی (رفیع الدین ہاشمی)۔

Pakistan Movement and Balochistan [تحریک پاکستان اور بلوچستان]، پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر۔ ملنے کا پتا: مکتبہ شال، ۲۷۲/ اے، او بلاک ۳، سیٹلائٹ ٹاؤن، کوئٹہ۔ صفحات: ۱۷۶۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی ۳۰ سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں، ان میں سے ۱۲ کتابیں صوبہ بلوچستان، اس کے عوام اور اس کے مختلف گوشوں کے بارے میں ہیں۔ پروفیسر انور رومان کے مطابق "ڈاکٹر انعام کی تمام محنت، رت جگے، حوالوں کی تلاش، بلوچستان، پاکستان اور اسلام کے لیے وقف ہے"۔

زیر نظر کتاب میں قیام پاکستان سے قبل بلوچستان کی سیاسی حالت، مسلم لیگ کے قیام اور اس کی سرگرمیوں، اخبارات کے کردار، مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن اور قائداعظم کے دورے کے متعلق قلم اٹھایا گیا ہے۔ قیام پاکستان کے سلسلے میں بلوچی شعرا کی چند نظموں کے تراجم بھی شامل ہیں۔ پیش لفظ میں مصنف نے چاغی میں کیے جانے والے جوہری دھماکوں کو بلوچستان کے لیے اعزاز قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ان دھماکوں کی بدولت ملت پاکستان دنیا بھر میں سرخرو ہو گئی ہے۔

کتاب میں تحریک پاکستان کے حوالے سے بہت سی تصاویر بھی شامل ہیں لیکن آخری ۱۸ تصاویر کے نیچے کوئی تعارفی جملہ نہیں ہے۔ اسی طرح کتابیات میں ۱۱ حوالے درج ہیں۔ متداول طریقہ یہ ہے کہ کتابیات کا قلم (font) عموماً متن کتاب کے قلم سے کم ہوتا ہے، اس کا خیال رکھا جانا چاہیے۔ اپنے موضوع پر یہ قابل مطالعہ کتاب ہے۔ مصنف نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے اہم لوازمہ جمع کر دیا ہے جو عام قارئین کے علاوہ، تاریخ پاکستان کے طلبہ اور اسکالرز کے لیے بہت معاون ثابت ہو گا (محمد ایوب منیر)۔

ماہنامہ محدث (سود نمبر)، مدیر اعلیٰ: حافظ عبدالرحمن مدنی۔ ناشر: مجلس التحقیق الاسلامی، ۹۹ جے، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ صفحات: ۲۳۶۔ قیمت: ۳۸ روپے۔

موقر جریدہ محدث لاہور کے مدیر اعلیٰ جناب حافظ عبدالرحمن مدنی دین کے لیے تڑپ رکھنے والی ایک دردمند شخصیت ہیں۔ سود کے مقدمے کے سلسلے میں حافظ صاحب نے کراچی اور اسلام آباد میں سپریم کورٹ میں پیش ہو کر اپنے تفصیلی بیان کے ذریعے سود کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلاً روشنی ڈالی (ص ۷۲ تا ۱۲۰)۔ علاوہ ازیں اس موضوع کے حوالے سے انھوں نے لاہور میں اہل علم کی متعدد مجالس کا انعقاد کیا۔

محدث لاہور کا زیر تبصرہ خاص شمارہ بھی آپ کی انھی کاوشوں کا تسلسل ہے۔

ڈاکٹر ظفر علی راجا نے سپریم کورٹ میں پیش ہو کر دلائل دینے والے اصحاب علم کی آرا کو مختصراً اپنے مضمون میں جمع کر دیا ہے۔ پروفیسر خورشید احمد صاحب نے عدالت میں جو بیان دیا' اس کا خلاصہ راجا صاحب نے اس طرح پیش کیا ہے: "موجودہ سودی نظام زر آیندہ نصف صدی کے اندر اندر پوری دنیا میں ناکام ہو جائے گا لہٰذا ماہرین ابھی سے ایک نئے معاشی اور مالیاتی سسٹم کا خاکہ وضع کرنے کے کام پر لگ گئے ہیں اور اس سلسلے میں خاصی پیش رفت ہو چکی ہے..... عالمی ماہرین جس نئے مالیاتی نظام پر متفق ہو رہے ہیں وہ اسلامی نظام زر سے بہت قریبی اور حیرت انگیز مماثلت رکھتا ہے...." (ص ۱۱)۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ ' حافظ حسن مدنی' مولانا صلاح الدین یوسف' ریاض الحسن نوری' پروفیسر عبدالجبار شاکر' حافظ عزیز الرحمٰن' حافظ ضیا اللہ برنی' محمد عطاء اللہ صدیقی اور ڈاکٹر ڈی ایم قریشی کے مضامین موضوع زیر بحث کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل روشنی ڈالتے ہیں' مثلاً: تجارتی سود کی حرمت' افراط زر کا مسئلہ' قرضوں کی اشاریہ بندی (indexation) کی ماہیت اور اس کی شرعی حیثیت' انٹرسٹ (interest) اور بلاسود بنک کاری' اور مغرب میں سودی بنک کاری کے بدلتے رجحانات وغیرہ۔ بہ حیثیت مجموعی یہ ایک قابل قدر علمی کاوش ہے اور مسئلہ سود کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ شمارہ ان افراد کے لیے بھی دل چسپی کا باعث ہو گا جو سپریم کورٹ کی بحث کی تفصیل جاننا چاہتے ہیں۔ البتہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ دیگر اہل علم اور بنک کاری سے وابستہ افراد' خاص طور پر اسلامی ترقیاتی بنک وغیرہ کی طرف سے پیش کردہ آرا اور معلومات کو بھی قدرے تفصیل سے احاطۂ تحریر میں لایا جائے اور ان پر نقد و نظر بھی کیا جائے (میاں محمد اکرم)۔

نوٹس داخلہ سیشن 2000ء

مری ہلز

پاکستان انٹرنیشنل پبلک سکول و بورڈنگ ہاؤس

بیرون ملک مقیم احباب کے بچوں کے لیے غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ سے وابستہ

پاکستان میں اپنی نوعیت کا واحد رہائشی تعلیمی ادارہ

کلاس اول تا ششم برائے طلبہ و طالبات

- جدید ترین تعلیم
- انگلش میڈیم
- کمپیوٹر لیب
- معیاری ہاسٹل
- حفظ القرآن
- اسلامی تربیتی ماحول
- خطاطی و آرٹ
- رائیڈنگ کلب
- جسمانی تربیت

برائے رابطہ: ڈائریکٹر

پاکستان انٹرنیشنل پبلک سکول و بورڈنگ ہاؤس

98- کارٹ روڈ مری ضلع راولپنڈی (پاکستان) فون و فیکس: 410954 (0593)

مدیر کے نام

محمد درویش، نوشہرہ

ترجمان القرآن میں اکثر اخوان یا عرب دانش وروں پر مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ اس صدی میں اسلام کے حوالے سے یقیناً اخوان المسلمون کا ایک کردار ہے تاہم حکمت عملی اور جدوجہد کے حوالے سے الجزائر کے اسلامک فرنٹ، ایران، سوڈان اور ترکی کی تحریکوں کو ماڈل بنایا جائے، اور ان کا مطالعہ بھی کیا جائے۔ خاص طور پر ڈاکٹر حسن ترابی، استاذ اربکان، استاذ یوسف القرضاوی، امام خمینی اور شیخ راشد الغنوشی کے افکار اور نئے حالات میں کام کے حوالے سے حکمت عملی، اگر ترجمان کے صفحات کی زینت بنے تو مفید رہے گا۔

ترجمان القرآن کا ماٹو ہے: مستقبل اسلام کا ہے۔ نئی صدی میں نت نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ نئی ایجادات، تہذیبی تصادم، عالم گیریت اور انسانی ذہن کی وسعت کی وجہ سے نئے مسائل اجتہاد اور زمینی حقائق حالات کے مطابق حقیقت پسندانہ رویے کا تقاضا کرتے ہیں۔ اگر ترجمان میں مختلف اسلامی مفکرین اور مغربی دانش وروں کے مقالات اور اجتہادی کام کو وقتاً فوقتاً پیش کیا جاتا رہے، خاص کر خاندانی منصوبہ بندی، کلوننگ، ٹیسٹ ٹیوب بچے، اعضا کی پیوند کاری، الیکٹرانک میڈیا کا استعمال، انسانی حقوق، خواتین کے کام کے حوالے سے حدود، مغرب کے ساتھ مکالمہ اور اس طرح کے دیگر مسائل پر مذاکرے اور مقالات تو فکر و نظر کی نئی راہیں کھلیں گی اور فکری رہنمائی کا فریضہ بھی بہ خوبی انجام پاسکے گا۔

مذہبی لوگوں کے حوالے سے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک خاص ذہن اور سوچ ہے کہ یہ لوگ تنگ نظر، ہٹ دھرم اور متشدد ہوتے ہیں۔ زمینی حقائق سے دور ہوتے ہیں، اور اپنے علاوہ ہر کسی کو برا سمجھتے ہیں۔ برداشت اور رواداری کے الفاظ سے ناآشنا، اور معمولی باتوں پر جذباتی ہو جاتے ہیں۔ اپنی غلطی کبھی تسلیم نہیں کرتے اور دوسروں کی رائے کا احترام نہیں کرتے۔ شاید ان الزامات میں کچھ حقیقت بھی ہو تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے مضامین شائع کیے جائیں جن سے ان باتوں کا ابطال ہو۔

تزکیہ و تربیت کے لیے اگر حضرت داتا گنج بخشؒ کی کشف المحجوب سے منتخب حصے شائع کیے جاتے رہیں تو تقویٰ، للّٰہیت اور تزکیہ نفس کا سامان ہو سکتا ہے۔

کاشف حفیظ صدیقی، کراچی

تحریکی مسائل، طریقۂ دعوت، انداز تربیت یا تنظیمی ڈھانچے کے حوالے سے موضوعات میں یکسانیت آچکی ہے۔ آپ اخلاق کی چٹکی، سیرت کے گوشے، یا صحابہؓ کے واقعات، یا پھر اکابر امت کی تحریروں سے انتخاب بھی شامل کر سکتے ہیں۔ عبدالکریم عابد صاحب نے "پہلی بات" (ہفت روزہ فرائیڈے اسپیشل) میں کئی اہم، نئے موضوعات پر دلیرانہ قلم اٹھایا ہے بلکہ ان کا حل تجویز کر دیا ہے۔ نگاہ اس طرح کے مسائل پر تفصیلی گفتگو ترجمان القرآن میں ڈھونڈتی ہے۔ اس طرح کے جرأت آمیز اور فکر انگیز مسائل کی جگہ ضرور ہونا چاہیے تاکہ رسالہ ایک خاص طبقہ فکر اور یکسانیت سے نکل کر فکری ارتقا کا باعث بنے۔

857

13 رہائشی منصوبوں کی شاندار کامیابی کا حامل اور آپ کے کامل اعتماد کا مظہر

احباب گروپ آف کمپنیز

مری کے منصوبہ جات

احباب گارڈنز زیر تکمیل

احباب ولاز تکمیل

ہل ویو اپارٹمنٹس تکمیل

لاہور کے منصوبہ جات

آب پارہ تکمیل

گلشن احباب فیز I تکمیل

گلشن احباب فیز II تکمیل

شاداب کالونی تقریباً تکمیل

گیلانی پارک تکمیل

گیلانی ہومز تکمیل

بلال ٹاؤن زیر تکمیل

ادارے کا تعارف

احباب ہاؤسنگ سوسائٹی ایک لمیٹڈ کمپنی ہے کوئی ذاتی ادارہ نہیں۔ چار اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تجربہ کار افراد بطور ڈائریکٹر کام کر رہے ہیں۔ کارپوریٹ لاء اتھارٹی سے کمپنی باقاعدہ منظور شدہ ہے جس کے اصولوں اور قواعد و ضوابط کے تحت کمپنی کو چلایا جا رہا ہے۔ لہذا افراد نہیں بلکہ کمپنی ممبران کے مفاد کے محافظ ہے۔ یہ کمپنی انکم ٹیکس آفس میں رجسٹرڈ ہے اور لاہور ایوان صنعت و تجارت کی ممبر ہے۔ ہر سال آڈٹ کرایا جاتا ہے اور ہر سال لاکھوں روپے انکم ٹیکس ادا کیا جا رہا ہے۔

ایگرو فارمز اسلام آباد، منظر کوہسار اسلام آباد، ہل ویو اپارٹمنٹس مری، احباب گارڈنز مری، شاداب کالونی لاہور، بلال ٹاؤن، گیلانی پارک لاہور اور گیلانی ہومز لاہور میں بکنگ جاری ہے۔

اسلام آباد کے منصوبہ جات

احباب ایگرو فارمز فیز I

منظر کوہسار زیر تکمیل

احباب ایگرو فارمز فیز II زیر تکمیل

خریداروں کے حق میں احتیاطیں

<u>زمینوں کی خریداری</u> مختار ناموں پر نہیں کی جاتی بلکہ زمینداروں کو ادا کی گئی قیمت پر ہی زمین خریدی گئی ہے اور اس قیمت کی رجسٹریاں اور انتقال کمپنی کے نام کرائے جاتے ہیں اور حکومت کے تمام ٹیکس اور فیس ادا کی جاتی ہے

<u>زمینوں کی ملکیت کی چھان بین</u> کیلئے محکمہ مال کے ریٹائرڈ افسران کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ پلاننگ اور ڈیزائننگ ماہر پلانرز سے کرائی جاتی ہے اور تمام نقشے و ڈیزائن متعلقہ محکموں سے منظور کروائے جاتے ہیں

<u>سروسز</u> تجربہ کار انجینئروں کی نگرانی میں ترقیاتی کام کرائے جاتے ہیں اور ایل ڈی اے اور سی ڈی اے کے اصولوں کے مطابق ۳۵ سے ۴۰ فیصد زمین سروسز کیلئے چھوڑی جاتی ہے ہمارے ترقیاتی کاموں میں سڑکیں، سیوریج، واٹر سپلائی، ٹیلیفون اور بجلی کے کام شامل ہیں ادارہ پہلے زمین کا مالک خود بنتا ہے اور پھر زمین فروخت کرتا ہے دوسرے اداروں کی طرح ایسا نہیں ہے کہ زمین کا مالک کوئی اور ہو اور بکنگ کوئی اور کرے۔

<u>ہمارا مقصد احباب</u> کو جھگڑوں سے پاک زمین فراہم کرنا اور پرامن بستیاں بسانا ہے۔

اللہ کے فضل سے ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمارے ترقیاتی کام L.D.A اور C.D.A کے معیار کے مطابق ہوتے ہیں

پمفلٹ مفت منگوائیں

سستے، جھگڑوں سے پاک پلاٹ مہیا کرنے اور نظریاتی بستیاں بسانے والا واحد ادارہ

احباب ہاؤسنگ سوسائٹی (پرائیویٹ) لمیٹڈ

ہیڈ آفس: بٹ ہاؤس، ۱-اے فیض روڈ اولڈ مسلم ٹاؤن لاہور
E mail: ahbab@nexlinx.net.pk فیکس 5837016 فون 5869549-5865371

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک 'اچھرہ' لاہور سے شائع کیا

زخمی، معذور اور بیمار مجاہدین، مہاجرین کا ادارہ

کشمیر سرجیکل ہسپتال

زیر اہتمام: پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن

- اکتوبر 1990 سے جون 1999ء تک 360000 ہزار مریضوں کا مفت اور مکمل علاج کیا گیا۔
- 1000 سے زائد افراد کو فراسٹ بائٹ سے نجات دلا کر معذور ہونے سے بچا لیا گیا۔ (الحمدللہ)
- تمام مہاجرین اور عسکری تنظیموں کے مجاہدین کا مکمل اور مفت علاج کیا جا رہا ہے
- کشمیر سرجیکل ہسپتال کے تحت متحدہ جہاد کونسل میں شامل تمام تنظیموں کے کیمپوں 60 فرسٹ ایڈ سنٹر کام کر رہے ہیں
- روزانہ 250 سے 350 مریضوں کو مفت طبی امداد فراہم کی جاتی ہے
- ہسپتال کے زیر اہتمام مہاجرین کے کیمپوں میں چار مستقل ڈسپنسریاں اور چار ایمبولینس گاڑیاں ہمہ وقت مصروف کار ہیں جبکہ کیمپوں میں چار نئی ڈسپنسریاں قائم کی جا رہی ہیں۔
- مظفر آباد اور کوٹلی میں چار ایمبولنس گاڑیاں ہمہ وقت مصروف کار ہیں
- دو نئے وارڈ کی تعمیر جاری ہے
- معذور مجاہدین اور مہاجرین کو 800 سے زائد مصنوعی اعضاء لگائے گئے

ہسپتال کے لئے تعاون صرف کراس چیک/ ڈرافٹ کی صورت میں ارسال کریں۔ ٹریولر چیک کی صورت میں رقم ارسال نہ کریں۔

کیا آپ کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے



خوش نصیب ہے جو گھر بیٹھے

★ غزوہ ہند میں شریک ہے ★ اپنی ملت کی زخمی شہ رگ سے بہتے لہو پر مرہم رکھ رہا ہے ★ زخمی و معذور مجاہدین و مہاجرین کی خدمت اور عیادت کا ثواب حاصل کر رہا ہے ★ عظیم ملی فریضے کی ادائیگی کر رہا ہے

اور رسول ﷺ سے جنت کی بشارت پا رہا ہے (الحدیث) اور جو اس سے محروم ہے وہ یقیناً بہت ہی محروم ہے

آپ نقد عطیات کے علاوہ ادویات کی صورت میں بھی مدد کر سکتے ہیں



اکاؤنٹ نمبر 1128
بنک آف پنجاب
مظفر آباد آزاد کشمیر

تعاون کے لیے

ڈاکٹر محمود حسین گیلانی (میڈیکل سپرنٹنڈنٹ)
کشمیر سرجیکل ہسپتال پولٹری فارم روڈ مظفرآباد آزاد جموں کشمیر
فون: 058810-3700

C .P.L. 236.

Phone : 7587916
7585590

Monthly TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE,